دیوانِ حالی

مولانا الطاف حسین حالی

مقدمہ
رشید حسن خاں

اردو اکادمی۔ دہلی

دیوانِ حالیؔ

ہدیہ منجانب : سلما حسین

دیوانِ حالؔی

مولانا الطاف حسین حالؔی

مقدمہ

رشید حسن خاں

اُردو اکادمی، دہلی

سلسلہ مطبوعات اُردو اکادمی نمبر ۱۲

تحقیقی واشاعتی کمیٹی کے اراکین

DEWAN-E-HALI

FOREWORD: RASHEED HASAN KHAN

PRICE RS. 24-00

قیمت ـــــــ ۲۴ روپے

سنہ اشاعت دوم : فروری ۱۹۹۱ء

بہ اہتمام ـــــــ ڈاکٹر انتظار مرزا

طباعت ـــــــ ثمر آفسیٹ پرنٹرز، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-7121-062-7

حرفِ آغاز

اُردو اکادمی، دہلی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ دہلی کی تہذیبی، ادبی اور سماجی زندگی پر مختلف حضرات سے مسودات تیار کرائے جائیں کیوں کہ عرصہ سے اس طرح کی کتب کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی پیش نظر کتاب ہے۔

یہ دیوانِ حالی اوّل کا عکسی ایڈیشن ہے۔ ہماری درخواست پر جناب رشید حسن خاں صاحب نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ ہم خاں صاحب کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ہماری درخواست پر اپنے گراں قدر مقدّمے سے نوازا۔

اکادمی کی کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی اس طرح کی کتب قارئین کے لیے پیش کرتی رہے۔

سید شریف الحسن نقوی
سکریٹری

پیش لفظ

الطاف حسین حالؔی کی نظم و نثر دونوں کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ اُن کا اسلوب صاف اور سادہ ہے جسے خلوص اور دردمندی نے لطافت، جاذبیت اور تاثر سے ہم آہنگ کیا ہے۔

حالؔی کی ادبی تربیت غالبؔ اور شیفتہؔ کی صحبتوں میں ہوئی تھی۔ اُنھوں نے شعر گوئی کی ابتدا مستعار اور روایتی انداز میں نہیں کی بلکہ اُنھوں نے فنی اظہار کے لیے خود اپنی حقیقی آواز اور اپنا اسلوب پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے عہد کی نوجوان نسل میں حالؔی سب سے بہتر غزل گو ہیں۔ اس عہد میں اُن کی شاعری حسن و عشق کی شاعری ضرور ہے۔ لیکن اس کی بنیاد حقیقت نگاری تخلیقی تخیل اور زندگی کے تجربوں پر ہے۔

غالباً حالؔی پہلے اردو نقاد ہیں جنھوں نے غزل پر نکتہ چینی کی ہے، یہ نکتہ چینی بہ قول ڈاکٹر یوسف حسین خاں "اصلاحی محرک کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت"، ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے جو سیاسی اقتصادی اور سماجی حالات تھے، اُن کے پیشِ نظر حساس اور ذہین حالؔی کا یہ خیال بے وجہ اور بے موقع نہیں تھا کہ عشق انسان کی عقل اور اخلاق کو خراب کر دیتا ہے۔ یہ وہ ظالم چیز ہے، جس نے

پوری پوری قوموں کو تباہ کر کے چھوڑا ہے۔ سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک نے حالی کی اس فکر کو تقویت دی۔ نئے حالات میں حالی نے جو نظمیں کہی ہیں، وہ صاف اور سادہ ہیں، لیکن پھیکی اور بے مزہ تھیں۔ اگر حالی غزل کے بہترین شاعر نہ ہوتے، اگر زبان پر انھیں غیر معمولی قدرت نہ ہوتی اور اگر شروع ہی سے انھوں نے صاف اور سادہ اسلوب اختیار نہ کیا ہوتا تو وہ نثر میں مقدمہ شعر و شاعری اور نظم میں مدّ و جزرِ اسلام اور مناجات بیوہ جیسی تحریروں اور نظموں کے خالق نہ ہوتے۔

اردو اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ بعض اہم اردو کتابوں کے پہلے اڈیشن آفسٹ کے ذریعے جوں کے توں شائع کر دیے جائیں۔ اس فیصلے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دوبارہ کتابت کرانے سے متن میں، پوری احتیاط کے باوجود، خاصی تعداد میں غلطیاں راہ پا جاتی ہیں۔ اس منصوبے کے تحت دیوانِ حالی کا پہلا اڈیشن بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا تو اُس پر مقدمہ لکھنے کے لیے کمیٹی نے اتفاقِ رائے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام تجویز کیا۔ مجھے بے انتہا مسرّت ہے کہ غیر معمولی مصروفیات کے باوجود خاں صاحب نے کمیٹی کی تجویز منظور کر لی۔

رشید حسن خاں صاحب کا ہمارے عہد کے ممتاز ترین محققوں اور نقادوں میں شمار ہوتا ہے۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں اُنھوں نے اردو تحقیق، تنقید اور لغت شناسی میں بہت اہم اور قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو املا پر ان کی کتاب اپنے موضوع پر اہم ترین کام ہے۔

دیوانِ حالی کا مقدّمہ مختصر ضرور ہے، لیکن خاں صاحب نے اُس میں حالی کی شعری اور فنّی صلاحیتوں کا بہت ہی منصفانہ اور بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اُنھوں نے ہی اپنے ذاتی کتب خانے سے حالی کے دیوان کا پہلا اڈیشن عنایت فرمایا تھا، جسے شائع کیا جا رہا ہے۔

میں خاں صاحب کی عنایت کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں

خلیق انجم

مقدّمہ

مولانا حالؔی کے دیوان کی یہ اشاعت اُن لوگوں کے لیے ایک نئی بشارت کا حکم رکھے گی جو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، مگر کلاسکی رنگِ تغزّل کے مارے ہوئے ہیں، اور آج بھی، یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے اِس عافیت آشوب زمانے میں بھی غزلیہ شاعری کو حصولِ مسرّت کا اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا بے مثال وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اِن خوش ذوق قدر شناسوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہو گی جن کے دل دُکھے ہوئے ہوں گے، اُس کا سبب خواہ غمِ عشق ہو یا غمِ روزگار۔ جن کے ذہنوں کو معاشرے کی بے رحم سچّائیوں نے احساسِ لطافت سے محروم کر دینے کی قسم کھا رکھی ہو گی اور جن کے دل بھری محفل میں تنہائی محسوس کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ غزل کے اچھّے اشعار کو محفلوں میں بلند آواز سے پڑھنے کے قائل نہیں ہوں گے، اُنھیں تنہائی کے لمحوں کا رفیق مانتے ہوں گے۔ جن کا تجربہ یہ ہو گا کہ غزل کا اچھّا شعر کچھ دیر کے لیے ماسوا سے بے نیاز کر سکتا ہے، دل میں اُتر کر اور سارے فلسفہ و منطق کو بھُلا کر انسان کو متحیّر کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کی سخن فہمی اُس شعر پر ایمان نہیں لاتی ہو گی جو نظر کو اور ذہن کو پہلے اپنی لفظیات کی طرف متوجّہ کر کے، بیان کی اُوپری سطح پر نگاہ اور خیال کو روکے رکھّے۔ وہ اُسی کو غزل کا اچھّا اور کام یاب شعر مانتے ہوں گے

جو فوری طور پر دل میں اُتر جائے اور احساس کا جُز بن جائے۔ حالی کے اِس دیوان میں رنگِ قدیم کی جو غزلیں ہیں، اُن کے اکثر اشعار اِن لوگوں کی بیاضوں میں جگہ پانے کے مستحق قرار پائیں گے اور یاد داشت کا حصّہ بن کر ساتھ دیتے رہیں گے۔ اب رہے وہ لوگ جو پُرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کی یاداشت میں تو ان میں سے اکثر شعر محفوظ ہوں گے اور وہ اُن کو بیسیوں بار پڑھ چکے ہوں گے اور اب ایک بار پھر اُن کا ذوقِ شعر اِس دیوان کے مطالعے سے لطف اندوز ہوگا اور یاد داشت کے اجزا روشن تر ہو جائیں گے۔

مولانا حالی کا یہ دیوان ایک اور اعتبار سے بھی ہماری توجہ کا طلب گار ہے۔ اِس مجموعے میں رنگِ جدید کی ترجمان جو غزلیں ہیں، اُن کی سطحیت اور بے رنگی اِس پر دلالت کرتی ہے کہ غزلیہ شاعری کو جب سماجی افادیت اور قومی اصلاح کے مضامین سے گراں بار کیا جائے گا اور اُسے وعظ و پند کا ترجمان بنایا جائے گا، تو یہ مقاصد خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، غزل اُس لطافت اور نفاست سے محروم ہو جائے گی جو اُس کی امتیازی صفت رہی ہے۔ اُس میں نہ تہ داری ہوگی نہ تاثیر۔

حالی نے جب یہ دیوان مرتّب کیا تھا، اُس وقت وہ قدیم رنگِ سخن سے اپنا رشتہ گویا توڑ چکے تھے اور اصلاحی شاعری کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔ پوری ایمان داری کے ساتھ وہ اِس بات کو مان چکے تھے کہ شاعری کا اصل مقصد قومی اصلاح ہونا چاہیے۔ جو شاعری سماجی افادیت کے کام نہیں آسکتی، وہ قابلِ التفات نہیں۔ یہ اندازِ نظر کی تبدیلی تھی، جس نے بالآخر عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ اُنھوں نے عالمِ باعمل کی طرح اِسی اندازِ نظر کے تحت بہت کچھ کہا، گویا ایسی شاعری کے نمونے بھی پیش کر دیے اور اِس اندازِ شاعری کو برحق ثابت کرنے کی خاطر مقدمہ شعر و شاعری میں طویل بحثیں کیں۔ تنقیدی بحثوں میں تو اس سے اُن کو بہت آسانی حاصل رہی کہ سماجی افادیت کے سیدھے سے اصول پر پوری شاعری کو پرکھ لیا اور فیصلے صادر کر دیے۔ شاعری کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک آسان سا طریقہ کار سامنے آگیا اور اُسی کی روشنی میں بعض مثنویاں ان کو غیر صحت مند عناصر کا مجموعہ نظر آئیں، قصیدے کا پورا ذخیرہ ناپاک دفتر معلوم ہوا اور

غزل کی عشقیہ شاعری بھی اسی ناپاک دفتر کا ایک حصّہ بن کر سامنے آئی۔ مگر اندازِ نظر کی یہ تبدیلی اُن کی فطرت کو نہیں بدل سکی۔ (فطرت کو کون بدل سکا ہے)۔ کلاسکی اندازِ سخن اُن کی فطرت کا تقاضا تھا، اُس سے بالجبر قطعِ تعلّق کر کے، اُنھوں نے نئے عقیدے کے تحت، قومی اصلاح کی خاطر شاعری شروع کی۔ خیر، اچھّا کیا، لیکن مولانا نے یہ بھی چاہا کہ غزل کو بھی ایسی مفید باتوں سے خالی نہ رکھّا جائے۔ اس میں تو اب تک عشق و عاشقی ہی کی فضول کہانیاں بیان کی گئی ہیں، اب اُس کا کفّارہ ادا کیا جائے اور اُسے مشرّف بہ اِصلاح کیا جائے؛ اور یہاں بات کچھ زیادہ بگڑ گئی۔ یہاں دو مشکلیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے پہلے وہ خود ایسی غزلیں کہہ چکے تھے، جن کے اکثر اشعار کلاسکی معیارِ غزل گوئی پر پورے اُترتے تھے۔ اِن میں سے بہت سے شعر زبانوں پر چڑھ چکے تھے اور دلوں میں اُتر چکے تھے۔ دوسری چیز تھی کلاسکی غزل کی وہ طاقتور روایت جس کو بدلنا ایسے شخص کے لیے آسان نہیں تھا جو خود اُس کا قائل اور پرستار رہ چکا ہو اور اُس سے مزاجی مناسبت بھی رکھتا ہو۔ عقیدہ بدل جانے سے مزاج بھی یکسر بدل نہیں پاتا۔ اندازِ نظر اور فطری مناسبت میں اِس طرح فاصلہ بڑھتا رہا اور اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید انداز کی غزلیں بے رنگی میں ڈوب گئیں اُن میں دل کی کہی ہوئی کم سے کم باتیں شامل ہو سکیں، دماغ کی سُجھائی ہوئی بیش تر باتیں لفظوں کے پھندوں میں کس کر شعر کے چوکھٹے میں سجائی جاتی رہیں۔

مولانا حالؔی کے اِس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصنافِ سخن بھی ہیں، مگر اُن کی حیثیت ضمنی ہے، اصل حیثیت غزلوں کی ہے، اور یوں صحیح معنی میں اِس کو غزلوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ یہ دیوان پہلی بار ۱۸۹۳ء میں چھپا تھا، مگر اُس طرح نہیں چھپا تھا جس طرح اب چھپ رہا ہے۔ مقدّمۂ شعر و شاعری کا شمار اُردو کی بنیادی تنقیدی کتابوں میں کیا جاتا ہے اور اب وہ ایک مستقل کتاب کے طور پر چھپتا رہتا ہے؛ مگر پہلی بار یہ متن اسی دیوانِ حالؔی کے ساتھ، مقدّمے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ صورت تو بعد کو پیدا ہوئی کہ مقدّمۂ شعر و شاعری نام کی ایک کتاب الگ ہے اور دیوانِ حالؔی ایک الگ کتاب ہے۔ ہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ "مقدّمۂ شعر و شاعری" حالؔی کا رکھّا ہوا نام نہیں۔ اُنھوں

نے اِس کے لیے صرف لفظِ "مقدّمہ" لکھا تھا، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ اُن کے ذہن میں اس مقدّمے کا الگ سے ایک تصوّر تھا ضرور۔ اشاعتِ اوّل (۱۸۹۳ء) کے سرورق پر تیسری سطر میں پہلے ذرا جلی قلم سے لفظ "مقدّمہ" لکھا ہوا ہے، پھر اُس کے نیچے خفی قلم سے ذیلی سُرخی کے طور پر یہ عبارت ہے: "جس میں شاعری کی ماہیت اور اُس کے حسن و قبح پر مفصّل بحث کی گئی ہے" اور پھر اُس کے نیچے ایک سطر میں لفظ "مع" ہے اور دوسری سطر میں جلی قلم سے "دیوانِ حالی" لکھا ہوا ہے۔ اِس اندازِ عبارت سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ حالؔی کے ذہن میں اِس مبحث پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کا واضح خاکہ موجود تھا۔ ہاں ضمنی طور پر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اُن کی غزلوں کا جو یہ مجموعہ ہے اور جس میں جدید انداز کی غزلوں کی تعداد قابلِ لحاظ ہے، اُن کو جو شخص پڑھے، وہ پہلے مقدّمے کو پڑھ چکا ہو اور اُن کے نقطۂ نظر سے اچھی طرح واقف ہو چکا ہو اور اُس کی روشنی میں وہ اِس حصّۂ کلام کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔

صورتِ حال کی مزید وضاحت کے لیے اُنھوں نے یہ اہتمام بھی کیا کہ ہر غزل کے متعلق یہ بھی بتا دیا کہ وہ قدیم رنگِ سخن سے متعلّق ہے یا جدید شاعری کے ذیل میں آتی ہے۔ اِس کے لیے اُنھوں نے قدیم غزلوں پر "ق" لکھ دیا۔ یہ نہایت مناسب انداز تھا، اور اِس سے پڑھنے والوں کو زیادہ آسانی کے ساتھ اُن کی غزلوں پر گفتگو کرنے کا اور نتیجہ نکالنے کا موقع ملا۔ بالفرض، حالؔی ایسا نہ کرتے، تب بھی اِن دونوں طرح کی غزلوں میں اِس قدر نمایاں فرق ہے کہ پہلی ہی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ غزل کس زمانے کی یادگار ہے۔

مثلاً دو غزلوں کے ان اشعار کو دیکھیے:

آگے بڑھے نہ قصّۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا، مگر نہ کھُلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم

دل کش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اب اس غزل کو پڑھیے:

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا — یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو! کہاں تک یہ آتش مزاجی — تمھیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی — بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا
بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن — جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالیؔ
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

اِس سیٹھی پھیکی غزل کو پڑھ کر شاید کوئی یہ سوچنے لگے کہ اِس میں کسی نقطۂ نظر یا اندازِ فکر کی تبدیلی کا نشان تو نہیں ملتا، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب اللہ ہی اللہ کرتے رہنے کا وقت آجاتا ہے اور اسی لیے اس میں بے کیفی اور بے نمکی ہے۔ ہاں یہ بات صاف ہے کہ اوپر کی دونوں غزلوں کے اشعار کے مقابلے میں اِس غزل کے شعر بالکل بے رنگ نظر آتے ہیں، اِس قدر بے رنگ جیسے اِن کا کہنے والا کوئی اور شخص ہو۔ ٹھیک ہے، اب ذرا ایک اور غزل کے یہ شعر پڑھیے:

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی — کہ اُن کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی، لیکن — حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گُل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گل چینی ہے یا اُٹس ہے، گُل چیں! یا ہے قزاقی
کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے — یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشّائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب اگر پہلوانی پر — گئے جیں مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی

اِن مثالیہ اشعار سے صورتِ حال اچھی طرح سامنے آجاتی ہے، خاص کر آخری دو شعر اندازِ نظر کی تبدیلی کی پوری طرح آئینہ داری کرتے ہیں۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ یہ تو

غزلوں کے منتخب اشعار تھے اور چُنے ہوئے شعر کبھی کبھی پیش کرنے والے کی بات کو کچھ زیادہ نمایاں کر لیا کرتے ہیں، اِس لیے میں ۲ دو مکمّل غزلیں نقل کرتا ہوں۔ پہلی غزل رنگِ قدیم سے تعلّق رکھتی ہے:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں — دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا — گھُلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
بنا ہے، لیجیے جب نام اُس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

خیال، بیان، آہنگ اور لہجے کا یکساں انداز ہے سب شعروں میں اور ہر شعر "دلِ پُردرد" کی بات کو دُہرا رہا ہے۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا دور کا بھی تعلّق اصلاحِ قوم سے نہیں، یہ تو دل کو جلانے اور گھر کو آگ لگانے کے معاملات ہیں۔ اب اِس کے مقابلے میں رنگِ جدید کی اس غزل کو پڑھیے:

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی
اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز — اِس میں شہری بھی ہیں، کوہی بھی ہیں صحرائی بھی
آنکھ سب ایک کھُلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی — اِس میں مسلم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی
جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے — گھات میں اُن کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی
دوست گر بھائی نہ ہو، دوست ہے تو بھی، لیکن — بھائی گر دوست نہیں، تو نہیں کچھ بھائی بھی
اے غمِ دوست تجھی پر نہیں اپنی گذران — کچھ فتوح اِس کے سوا اور ہے بالائی بھی
دلِ غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ — تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی
عقل ہے اپنی حماقت کے چھپانے کی اُنھیں — جنھیں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خود رائی بھی

عقل اور حُسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ
اُن کو خود رائی بھی پھبتی ہے، خود آرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تم سے ہمیں جی بھر کر
فرصت اے دوستو دُنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم، پہ رہے مُردوں سے بدتر حالیؔ
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

کیا اِس غزل کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟ کیا بے رنگی اور بے کیفی اِس کے ہر شعر اور ہر مصرعے سے ٹپکتی نہیں؟ چھٹے شعر میں بیان کی بے رنگی کے باوجود، ایک ذرا سا پہلو کنایے کا سا پیدا ہو گیا تھا، مولانا نے بھی اِس کو تاڑ لیا ہو گا، اور غالباً اِسی لیے اِس شعر پر یہ حاشیہ لکھ دیا ہے: "یعنی غمِ دنیا و غمِ زن و فرزند وغیرہ"۔ اِس "وغیرہ" میں سب کچھ آگیا۔ اِس قدر احتیاط کہ پڑھنے والے کا ذہن بھولے سے بھی کسی اور طرف نہ جانے پائے! کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ شاید اِس سے کچھ اور مراد ہو۔ کہاں تو وہ تیور کہ "لگا دے آگ کوئی آشیاں میں"، اور کہاں یہ احتیاط!

حالیؔ نے غزلوں کے علاوہ بہت کچھ کہا ہے۔ اس دیوان میں بھی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ نظموں میں حبِّ وطن اور اصلاحِ قوم کے مضامین کے دریا بہا دیے ہیں اور قطعوں اور رباعیوں میں بھی اِن مضامین کو شامل کیا ہے، یہاں تک کہ اکثر شخصی مرثیے بھی اِسی جذبے کے تحت کہے گئے ہیں، کہ اُن میں شخص سے زیادہ، ملکی حالات کا ماتم ہے اور ان حالات سے متعلق نقصانات کا تذکرہ ہے۔ ایسی اکثر نظمیں کم اثری سے قریب ہیں، مگر جو بے رنگی غزلوں میں نمایاں ہوئی ہے، وہ زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک بڑی وجہ اِس کی یہی ہے کہ دورِ اوّل میں، یعنی اُس زمانے میں جب وہ شیفتہ و مومن کے دائرۂ اثر میں تھے اور سرسیّد کے مریدِ با اخلاص نہیں ہو پائے تھے، یعنی فدائی نہیں بن پائے تھے، اُس زمانے میں اُنھوں نے جو غزلیں کہی تھیں، وہ محفوظ تھیں اور موجود تھیں۔ اگر سیاہ کو سفید کے مقابل رکھ دیا جائے تو اُس صورت میں سیاہی جس طرح اپنے آپ کو نمایاں کرے گی، اُس سے ہم سب واقف ہیں۔ دو واضح طور پر مختلف انداز سامنے تھے اور اِس تقابل نے جدید انداز کی غزلوں کی بے رنگی کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی دُہرانے کی ہے کہ کلاسکی اندازِ غزل سرائی کی جو نہایت درجہ مستحکم اور ہمہ گیر روایت

موجود تھی اور موجود ہے، وہ ایسی ہلکی پھلکی پیوند کاری کو قبول کر ہی نہیں سکتی تھی، خاص کر اُس صورت میں جب کہ پیوند کار نیا نیا "مسلمان" ہوا ہو اور کوشش کر کے پچھلے عقیدے کو بھول جانا چاہتا ہو۔ عقیدہ تو بدل گیا، کہ وہ اپنے بس کی چیز تھی، طبیعت نہیں بدل پائی کہ وہ اپنے قابو کی بات نہیں ہوتی اور غزل کی روایت بھی نہیں بدل پائی کہ وہ کسی ایک مصلح تو کیا، سیکڑوں مصلحین کے بس کی بات نہ تھی اور نہ ہے۔ حالؔی مصلحِ قوم بن سکتے تھے، اور بنے، واعظِ قوم ہو سکتے تھے، اور ہوئے، مگر ایسا مجتہد یا مجدد بننا ان کے قابو سے باہر کی بات تھی کہ ایک صنف کے مزاج، انداز، اُس کی اندرونی فضا اور اُس کے ٹھاٹھ کو اس آسانی کے ساتھ بدل دیں اور اُس میں ایسے مضامین شامل کرنا چاہیں، جو کتنے ہی مفید ہوں، مگر غزل کے اپنے موضوعات کے مقابلے میں بالکل بے رنگ بلکہ بدرنگ نظر آئیں۔ اُتنی بڑی روایت کو اِس قدر ہلکے پھلکے عناصر بدل ہی نہیں سکتے تھے۔

مگر ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ جدید رنگ کی جو غزلیں ہیں اور بہ ظاہر جن کا انداز الگ سا ہے، اُن میں جگہ جگہ ایسے شعر بھی ملتے ہیں کہ پڑھنے والا ذرا سی دیر کے لیے حیران رہ جاتا ہے۔ اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح ان شعروں کو رنگِ قدیم کی غزلوں سے مختلف سمجھے۔ کچھ اور کہنے سے پہلے، میں جدید غزلوں سے ایسے چند شعر نقل کرتا ہوں، انھیں دیکھیے:

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا	بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید	خود بہ خود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت	پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے	مِنھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت	نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل	کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
اُن کو حالؔی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں	دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب!
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یہاں سزا کے بعد
مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب!
یا اِسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جاتے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں، مگر
وہ آئے انجمن میں، تو پھر انجمن کہاں
کہتا ہے، خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے، ہم جہاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بات یہ ہے کہ خیال کو بدلنا جس قدر آسان ہے، طبیعت کا بدلنا اُسی قدر مشکل ہے۔ کتنے ہی پہرے بٹھائے جائیں اور کیسی ہی تدبیریں کی جائیں اور نقطۂ نظر کے کتنے ہی حصار کھینچے جائیں، جہاں بھی ذرا نظر چوکی اور عالمِ شعر گوئی کی محویت نے ذہن پر غبار سا پھیلایا، وہیں طبیعت کے جوہر اپنی چمک دکھا جاتے ہیں اور بازگشت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں طبیعت کا جو اصلی تقاضا ہے اور فطرت کا جو حقیقی جوہر ہے، وہ خود بہ خود نمایاں ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد شاعر عالمِ ہوش میں آ کر کتنا ہی سوچے اور کچھ بھی خیال کرے، خواہ اپنے کو بُرا کہے کہ ابھی یہ میں نے کیا کہا، مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ جدید غزلوں میں جو قدیم انداز کے شعر ہیں، وہ ایسے ہی لمحاتِ بے خودی کی پیداوار ہیں، جب مفروضہ شعوری

کا احساس کچھ دیر کے لیے اونگھ گیا ہے اور حقیقی شعر گوئی کے جوہر موقع ملتے ہی اپنی چمک دکھا گئے ہیں۔

غزلیاتِ حالی کے سلسلے میں ہمیں چند باتیں ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے، اِس طرح ہم اُن کی غزلوں کا جائزہ بھی اچھی طرح لے سکیں گے اور تجزیہ بھی صحیح طور پر کر سکیں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حالی کی غزلیں خواہ قدیم ہوں خواہ جدید، مبتذل اشعار ان میں نہیں ملتے۔ جدید انداز کی غزلوں میں بھی سطحیت کتنی ہی ہو، عامیانہ پن نہیں۔ سوز و گداز کی اُن کے دل میں کمی نہیں تھی، ذوق میں پستی نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تنقیدی شعور موجود تھا۔ وہ جب تک دل کی باتیں کہتے رہے (اور یہ زمانہ طویل نہیں تھا) حقیقی غزل گو رہے اور جب ناصحِ مشفق بنے تو نصیحت آمیز باتیں کرنے لگے اور یوں ابتذال کو اپنی جگہ بنانے کا اچھی طرح موقع نہیں مل پایا۔ اُن کی فطری متانت بھی ایسے مضامین کی کچھ زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

حالی نے شاہ جہان آباد میں آتے ہی غزل گوئی کی حکمرانی دیکھی ہو گی، کہ شاعری غزل گوئی کا دوسرا نام تھا۔ یہ بھی دیکھا ہو گا کہ شاہ نصیر کا ایک رنگ ہے، ذوق کا ایک انداز ہے، مرزا غالب کا طرز سب سے جُدا ہے اور مومن کی شاعری نہایت درجہ مانوس اور دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے انداز میں منفرد بھی ہے۔ اس کے بعد شیفتہ کے نیم عاشقانہ نیم متصوفانہ طرزِ سخن سے بھی طبیعت آشنا ہوئی ہو گی۔ تنقیدی شعور مزاج کا جُز تھا، اُس نے شاہ نصیر اور اُستاد ذوق کے رنگ کا ہلکا پن اور پھیکا پن پہلے ہی دن خاطر نشین کر دیا ہو گا۔ مرزا غالب سے شاگردی کی نسبت تھی (وہ برائے نام سہی) ایک تو مرزا صاحب کا چھا جانے والا انداز اور پھر شاگردی کا واسطہ، مگر یہاں بھی خود شناسی اور خود آگہی کام آئی ہو گی اور اس سچّی بات پر عمل کیا ہو گا کہ بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینا چاہیے۔ مومن سے حالی کچھ زیادہ قریب نہیں تھے اور شیفتہ سے قربت حاصل تھی۔ مومن اور شیفتہ کا انداز مختلف ہونے کے باوجود، بعض مشترک عناصر کا مجموعہ ہے۔ حالی کو اِن دونوں کی غزلیہ شاعری اپنے دل سے زیادہ قریب محسوس ہوئی ہو گی، مزاج تو لڑکپن سے ویسا ہی لے کر

آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگِ قدیم کی غزلوں میں وہ غالب کے نہ شاگرد معلوم ہوتے ہیں نہ پرستار، البتہ مومن اور شیفتہ سے "مستفید" نظر آتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ مومن کی شاعری دل کی آواز نہیں۔ اُن کی شاعری میں داخلی عناصر کم اور بہت کم ملتے ہیں۔ وہ میر کے قبیلے سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو اپنے انداز کے نواب مرزا شوق تھے، کہ زہر بھی کھالیں تو اثر نہ ہو اور مر جانے کی نوبت نہ آئے۔ زندگی بھر اُن کا عمل اِس مصرعے پر رہا کہ: ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ یہ سب برحق، مگر مومن کی شاعری میں عشق و تعشق کے وہ تقریباً سارے معاملات ملتے ہیں جو عشقِ مجازی کا حاصل ہوتے ہیں۔ حالی صوفیوں سے زیادہ تقدس رکھتے تھے، اور پیش دستی سے اُن کے مزاج کو بہ ظاہر دور کا بھی ربط نہ تھا، لیکن تصوّف سے بھی اُن کو عملی یا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ دل میں گداز تھا، اور اُن جذبات سے اچھی طرح آشنا تھے جو محبت کا نتیجہ ہو سکتے ہیں اور یوں مومن کی شاعری سے اُن کا متاثر ہونا کچھ ان ہونی بات نہیں۔ اُن کے بہت سے اشعار چغلی نہیں کھاتے ہیں، گواہی دیتے ہیں اِس کی کہ وہ ساری پارسائی کے باوجود مومن کے انداز سے اور اُن کی باتوں سے بہت متاثر تھے۔ ذرا اِن اشعار کو دیکھیے، کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایک سعادت مند شاگرد اپنے استاد کے رنگ کو فیضِ باطن سمجھ کر جذب کر رہا ہے:

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے — تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے، ورنہ یہاں — طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا!

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم، کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

دردِ فراق و رشکِ عدو بھی گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
ہنستے ہیں اُس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

یارب اِس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اُس کو ہم سے ربط، مگر اِس قدر کہاں
کہتا ہے، خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عُدو
عُذر اُن کی زباں پہ آنے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر اُلفت بہت جتانے لگے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جا بے سوءِ ظن ہے

کہتے ہیں، طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

مانعِ گل گشت ہے بیمِ خزاں
موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدرِ نعمت ہے بہ قدرِ انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

آپ نے دیکھا! مومن کی بعض خصوصیات کس قدر بھرپور پن کے ساتھ اپنی روشنی کو پھیلا رہی ہیں۔ غالب کو طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا قیامت معلوم ہوا تھا، وہ بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے، مگر مومن کے رنگ میں شعر کہنا گویا پُلِ صراط پر

چلنا ہے کہ ہر لمحہ ابتذال کے جہنّم میں گرنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ حالیؔ نے مومنؔ کے یہاں سے صرف اُن کے اندازِ بیان کا اثر قبول کیا ہے۔ اُن کے یہاں جو شوخی ہے، اُس سے حالیؔ کا کلام پاک ہے (یا یوں کہیے کہ خالی ہے)۔ یہ حالیؔ کی سنجیدہ مزاجی کا نتیجہ ہے، ورنہ مومنؔ کے اِس قدر قریب چلے جانے کے بعد، اُن کی شوخ بیانی سے بچنا بہت مشکل ہے (کاش نہ بچے ہوتے!)۔

شیفتہؔ کے اثرات بھی حالیؔ کے یہاں کہیں دبے ہوئے، کہیں اُبھرے ہوئے نظر آجاتے ہیں، مگر اُن کی پہچان ذرا دشوار سی ہے۔ بات یہ ہے کہ خود شیفتہؔ کے یہاں انداز کا وہ قطعی پن نہیں پایا جاتا جو مثلاً مومنؔ کے یہاں ہے۔ ایک نیم انداز کی سی کیفیت ہے، پھر بھی طرزِ سخن اور اندازِ کلام سے کچھ نہ کچھ سُراغ تو مل ہی جاتا ہے۔ مثلاً اِن اشعار کو ایک بار غور سے پڑھیے:۔

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزہ ۔۔۔ کہتے ہیں لوگ: جان کا اِس میں زیاں ہے اب

رات اُن کو بات بات پہ سو سو دیے جواب ۔۔۔ مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید ۔۔۔ خود بہ خود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی ۔۔۔ پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

ملتے ہی اُس کے بھول گئیں کلفتیں تمام ۔۔۔ گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ۔۔۔ ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے

بے قراری تھی سب امّیدِ ملاقات کے ساتھ ۔۔۔ اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

یہ لکھا جا چکا ہے کہ حالی کو تصوّف سے کچھ ایسا لگاؤ نہیں تھا، بل کہ یوں کہیے کہ تھا ہی نہیں۔ رسمِ زمانہ کے مطابق بھی غیب و شہود کے پھیر میں نہیں پڑے اور ماورائے مکان و لامکاں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ ابتدا میں جب وہ واقعتاً غزل کہتے تھے تو اُس زمانے میں ذہنی طور پر مومن و شیفتہ سے قریب رہے اور جب اس مصروفیت کو کوے ملامت کا طواف قرار دے کر، دوسری طرف نکل گئے تو اصلاحِ قوم کے خیالات میں ڈوب گئے اور ادب کی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ یہ وہ عالم ہے جہاں پہنچ کر آدمی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، حالی بھی قلبِ ماہیت کے اِس تیزابی عمل سے دوچار ہوئے اور بہ خوشی، اِس لیے یہاں بھی اُن کو صوفی بننے کی یا صوفیوں جیسی باتیں کرنے کی مہلت نہیں ملی اور اصل بات تو یہ ہے کہ مزاجاً بھی اُن کو اس سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ اُنھوں نے ایک قطعے میں اپنی شاعری (یا صحیح لفظوں میں غزل گوئی) کے متعلق لکھا ہے:

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر، حیف!	طبعِ رنگیں تھی مےِ عشق سے جب متوالی
اپنی رو داد تھی، جو عشق کا کرتے تھے بیاں	جو غزل لکھتے تھے، ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ اُلفت ہے نہ چاہت، نہ جوانی نہ اُمنگ	سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر	نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی

یہ حالی کا اپنا بیان ہے اور اس پر شک کرنے کا حق مجھ کو بہر حال نہیں پہنچتا۔ اُن کے اشعار میں تغزّل کی جو خوبی ہے اور دل کو چھو لینے والی جو بات ہے، وہ بھی مےِ عشق سے متوالی طبیعت کی گواہی دیتی ہے؛ مگر افسوس! کہ ہم اُن کی داستانِ عشق سے ذرا بھی واقف نہیں۔ اللہ جانے وہ کیسا عشق ہو گا جو اُنھوں نے کیا ہو گا! اُنھوں نے اشعار میں جو باتیں کہی ہیں، وہ تو ایک آشنائے راز اور ایک سرگشتۂ کوے ملامت ہی کہہ سکتا ہے، اور اِس طرح کہی ہیں، جس طرح کہی جاتی ہیں اور جس طرح کہنا چاہیے؛ مگر مجھے اِس میں کبھی کبھی شک سا ہوتا ہے کہ اُن جیسا وضع دار اور شرمیلا آدمی اپنے اُس معشوق سے (جس سے ہم میں سے کوئی بھی واقف نہیں) کیا رو در رو بھی ایسی باتیں

کہہ سکا ہوگا! شاید نہیں کہہ پایا ہوگا، جبھی تو وہ ساری تمنائیں اور حسرتیں پُر تاثیر اشعار کے سانچوں میں ڈھل گئیں۔ افسوس! خوفِ فسادِ خلق سے کیا کیا ناگفتہ رہ گیا!

تصوّف کی طرح اُن کے یہاں فلسفیانہ انداز کی باتیں بھی گویا نہیں ہیں۔ اُن کے کلام میں فکر و فلسفے کے وہ عام عناصر شامل نہیں ہو سکے جو فارسی اور اردو شاعری کے بڑے حصّے پر محیط ہیں اور جنھوں نے غزل کے لہجے کو علمی شائستگی اور فکری وقار بخشا ہے اور بے کراں وسعت سے آشنا کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس کمی کا شمار تو کرنا چاہیے، مگر اُس کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے، اِس کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ جو شخص "سراسر حالی غزل" لکھے گا، اور جس کی طبیعت میں الفت، چاہت، امنگ بھری ہوئی ہے اور سر سودا سے خالی نہیں اور دل عشق سے معمور رہے، ایسے شخص سے تصوّف یا فلسفے کے مضامین دُہرانے کا مطالبہ کرنا یوں بھی خوش مذاقی کے منافی ہے۔ مگر یہ غم ضرور ہے کہ ایسا شخص جو تصوّف اور فلسفے کے پھیر میں نہیں آیا، وہ اصلاحی شاعری کے پھیر میں آگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تصوّف اور فلسفے سے بالکل غیر متعلّق رہنے کی یہ سزا فطرت کی طرف سے اُن کو ملی ہو۔

صوفیانہ باتوں کی طرح جام و مینا کا تذکرہ بھی اُن کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے، ہاں اس کا کفّارہ اُنھوں نے یوں ادا کیا کہ صوفی اور زاہد کو کم تر طنز اور بیش تر تمسخر کے تیروں کا نشانہ بنایا۔ ہلکے پھلکے وار بھی کیے ہیں اور گہرے تیر بھی مارے ہیں، صرف دو چار شعر نقل کرتا ہوں، اِنھی سے صورتِ حال کا اندازہ ہو جائے گا:

جھگڑوں میں اہلِ دین کے حالیؔ پڑیں نہ آپ | قصّہ حضور سے یہ چُکایا نہ جائے گا

کہیں افطار کا حیلہ تو نہیں یہ حالیؔ | آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے | اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

اے شیخ! بن پڑے گی نہ کچھ، ہاں کیے بغیر
گو مے ہے تند و تلخ، پہ ساقی ہے دل رُبا

تونے واعظ ہم کو شرمایا عبث
آنکلتے تھے کبھی مسجد میں، ہم

ایک دو جگہ یہ لے ذرا اونچی ہو گئی ہے، اتنی اونچی کہ لطافت پر حرف آگیا ہے، مثلاً:

نہایت آپ کی ہے اُن کی ابتدا اے شیخ
گو زن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا

مگر ایسے اشعار بس اِکادُکا ہیں۔ اکثر مقامات پر بیان کی لطافت نے شعر کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، مثلاً:

نہ ہو برتاؤ میں جو رسم، وہ کیا یاد رہے
ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ، مگر

جتنی جتنے ہیں، سب ہم سے حذر رکھتے ہیں
عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید

دیوان میں مسلسل غزلوں کی کمی نہیں، مگر ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس میں مومن یا شاد کی طرح اپنی کسی داستان کو بیان کیا ہو۔ ان میں زیادہ تر غزلیں تو اصلاحی مضامین کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں، صرف تین غزلیں مصلحانہ مضامین سے خالی ہیں۔ ایک تو وہ مشہور غزل، جس کا مطلع ہے:

دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز

یہ غزل دِلّی کی بربادی کا دردناک مرثیہ ہے، بات دل سے نکلی ہے اور تاثیر میں ڈوب کر نکلی ہے۔ آج بھی اِس کو پڑھتے وقت تباہی و بربادی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ دوسری دو غزلوں کے مطلعے یہ ہیں:

اے شباب، اے شادمانی الوداع
اے بہارِ زندگانی الوداع

دردِ دل کو دوا کیا تونے
دل کو درد آشنا کیا تونے

پہلی غزل جوانی کا مرثیہ ہے، وہی جوانی جس کے لیے حالی نے کہا تھا:

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

اِس میں شک نہیں کہ یہ غزل تاثیر سے معمور ہے۔ ایسی ہی باتوں سے اِس کا یقین ہونے لگتا ہے کہ اُنھوں نے بھی کسی پردہ نشیں سے عشق کیا ضرور ہوگا، نرے پرہیزگاروں کو جوانی کی کج رائی کی یاد اِس طرح ٹوٹ کر نہیں آتی۔ دوسری غزل حمد میں ہے اور یہ بھی بُری نہیں۔

حالؔی کے یہاں تشبیہات و تعبیرات کا حصّہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُن کی سادہ بیانی، تکلّف سے بری انداز کی طلب گار تھی اور اُنھوں نے ایسا ہی پیرایۂ اظہار اختیار کیا۔ لیکن زبان اور شاعری کی روایت اپنے اثرات سے کسی کو بالکل محروم نہیں رکھا کرتی، حالؔی کے یہاں بھی کچھ اشعار میں اِن کی جلوہ گری ہے۔ اِن کو پڑھ کر واقعتاً یہ احساس ہوتا ہے کہ تعبیر تراشی کا اُن کو بڑا ملکہ حاصل تھا، جس کو وہ کچھ زیادہ کام میں نہیں لا پائے۔ ذرا اِن اشعار میں تعبیرات کے حُسن پر نگاہ ڈالیے:

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے اُلجھاو ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک
ہم سے پوچھے کوئی، ہوتی ہے محبت کیسی

مانعِ گُل گشت ہے بیمِ خزاں
موت کرتی ہے نگہبانی مری

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض غزلوں میں محاورہ بندی نمایاں ہے اور روزمرہ پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے، اگرچہ یہ اُن کا عام انداز نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض غزلیں اُنھوں نے شعوری طور پر اِس انداز میں کہی ہیں۔

ہیں مثالاً محض ایسی ایک غزل نقل کرتا ہوں :

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی — یہ کشتی یوں ہی پار اُتر جائے گی
رہیں گے نہ ملاّح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ — یہ عزّت تو جائے گی، پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یوں ہی عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالیؔ کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

پڑھنے والے کے ذہن میں ایک یہ بات بھی رہنا چاہیے کہ حالیؔ کے بہت سے شعر بندش کی سستی سے اور تعقید سے بوجھل ہو گئے ہیں، یا روانی پر بُرا اثر پڑا ہے۔ وہ کبھی اچانک ایسا اجنبی لفظ شعر میں رکھ دیتے ہیں کہ لہجے کی روانی ٹوٹ جاتی ہے، صرف دو مثالیں :

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں — آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے اِن آنکھوں نے — آج ویسا کوئی دے ہم کو دِکھا ایک ہی شخص

پہلے شعر میں "ہدر" آج بہت اجنبی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے شعر میں ناگوار تعقید ہے۔ ایسی باتوں سے بدحظ ہونے کی ضرورت نہیں، ہاں اُن کو نظر میں رہنا چاہیے۔

جن باتوں پر عام طور پر اتّفاق کیا جاتا ہے، اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ حالیؔ بہت دردمند دل ساتھ لے کر آئے تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ غم کھانے اور کُڑھنے کا بھی حصّہ اُن کی فطرت میں کچھ کم نہیں تھا۔ اُنھوں نے قومی اصلاح سے متعلق قطعہ لکھا ہو، رباعی لکھی ہو، طویل نظمیں لکھی ہوں یا غزلوں میں اُن مفاہیم کو ادا کیا ہو؛ ہر جگہ اُن کے دلِ دردمند کی پکار سنی جا سکتی ہے۔ اُنھوں نے کوشش

کی ہے سماجی اصلاح کے متعلقات کو عام لوگوں تک اِس طرح پہنچائیں کہ وہ بھی اُسی طرح اُن خرابیوں کو بُرا سمجھیں جس طرح شاعر سمجھ رہا ہے اور اُن کی اصلاح کے لیے اُسی طرح اُن کے اندر بھی جذبۂ بے اختیار پیدا ہو، جس طرح وہ شاعر کے دل میں موج زن ہے۔ مگر ہوا یہ کہ اکثر نظموں، قطعوں اور رباعیوں میں سپاٹ پن پیدا ہو گیا، جو شاعری کا سب سے بڑا عیب ہے۔ بات یہ ہے کہ حالی مرثیہ اچھا لکھ سکتے تھے۔ جب وہ داستانِ پارینہ دُہراتے ہیں، یا کوئی ایسی بات کہتے ہیں جس کا اصلاً تعلق گدازِ دل سے ہو تو اُس وقت وہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس میں اُن کے دل کا گداز گو یا سما جاتا ہے۔ ناصحِ مشفق بن کر وعظ کہنے پر اُتر آتے ہیں، تب دل کا گداز اور طبیعت کا چُٹیلا پن اپنے اثرات کو تہہ نشیں نہیں کر پاتا۔ میں ایک مثال سے اِس کی وضاحت کروں۔ "مناجاتِ بیوہ" کا شمار اُردو کی بے مثال نظموں میں کیا جاتا ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ نظم بے مثال ہے۔ معلوم نہیں کتنی بیوائیں اِس کو پڑھ کر بار بار روئی ہوں گی۔ ہر شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے غموں سے معمور آیتوں کا صحیفہ کہنا چاہیے۔ اِس کے مقابلے میں اس معروف نظم کو پڑھیے جو یہاں سے شروع ہوتی ہے: "اے ماؤ بہنو بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے" یہ طویل نظم بھی عورتوں سے متعلق ہے، اِس میں بھی عورتوں کی وفا شعاری اور فرماں برداری کا بیان ہے، اُن کی مظلومیت بھی زیرِ بیاں آگئی ہے، مگر تاثیر کے لحاظ سے اس میں اور "مناجاتِ بیوہ" میں وہی نسبت ہے جو ایک اور سو میں ہو سکتی ہے۔ بات وہی ہے کہ مناجات میں حالی نے دل کا گداز بھر دیا ہے اور دُکھ درد کو بیان کیا ہے، اور دوسری نظم میں مولانا نے وعظ کیا ہے، لڑکیوں کو اُن کے فرائض یاد دلائے ہیں اور عورتوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی ہے۔ تاثیر آتی کہاں سے!

اِس دیوان میں غزلوں کے علاوہ اور جس قدر اصناف ہیں (تاریخوں کو چھوڑ کر) ان میں نسبتاً کم ایسی چیزیں ہیں جنھیں دوبارہ پڑھنے کو جی چاہے۔ البتہ ص ۱۹ پر یہ جو قطعہ ہے ۹ اشعار کا، یہ سب سے الگ ہے اور سب سے مختلف ہے، اور یوں مختلف

ہے کہ اِس میں جوانی کا مرثیہ کہا گیا ہے، پہلا شعر یہ ہے:

ہوئی ریحانِ جوانی کی بہار آخر حیف　　　　طبعِ رنگیں بھی مے عشق کی جب متوالی

"آزادی کی قدر" یا "انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" جیسے عنوانات کے تحت جو قطعات ہیں، اب سیاسی مصلحتیں اور ضرورتیں جو بھی کہیں، ایسے سب قطعے، مولانا کے سوانح نگار کے تو کچھ کام کے ہو سکتے ہیں، ان کی شعری حیثیت بہت کم زور ہے۔

ص ۱۴۴ سے رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ یہ اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں سے کئی رباعیاں بار بار پڑھی جا سکتی ہیں، مگر یہاں بھی وہی بات ہے کہ ص ۱۵۲ سے جو "رباعیاتِ قدیم" شروع ہوتی ہیں، اُن میں کچھ اور ہی خوبی اور حسن ہے، مثلاً اِس ایک رباعی کے سامنے اس سے پہلے کی بہت سی رباعیاں بے نور نظر آئیں گی:

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت　　　　مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی کا جانا　　　　عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

چوتھا مصرعہ کس قدر برجستہ ہے اور کیسا چسپاں ہے (یہی رباعی کا فن ہے اور یہی اُس کا حُسن ہے)۔

اِس دیوان میں مرثیۂ غالب بھی شامل ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شخصی مرثیوں میں یہ بے مثال اور منفرد مرثیہ ہے۔ حالی نے گویا کاغذ پر کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ اُن کی طبیعت کا گداز اِس کے ہر شعر میں سما گیا ہے:

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں　　　　اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو　　　　سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

ایسے شعر کوئی اوسط درجے کا شاعر تو خیر کہہ ہی نہیں سکتا، بڑا شاعر بھی بہ مشکل کہہ پائے گا اور وہی کہہ پائے گا جس کا دل واقعتاً ایسے حادثے سے خون ہو گیا ہو۔ یہاں دیکھنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ حالی نے حکیم محمود خاں کا بھی مرثیہ کہا ہے اور خاصا طویل مرثیہ کہا ہے، مگر اُس میں یہ بات نہیں۔ اس کی پرچھائیں بھی اُس پر نہیں پڑ سکی ہے۔ اصل وجہ تو خیر شخصی ربط اور ذاتی ربط ہے، مگر ایک بات یہ

بھی ہے کہ محمود خاں کے مرثیے میں حالی نے وہی انداز اختیار کیا ہے جو مثلاً ایک مورخ اختیار کرے گا۔ وہاں بھی وہ مرثیہ نگار کچھ کم ہیں، تفصیل نگار اور قومی نقصان کے محاسب زیادہ ہیں۔

حالی کا یہ دیوان، جیسا کہ ابتدا میں لکھا گیا ہے، ۱۸۹۳ء میں چھپا تھا۔ اُس کے بعد یہ بارہا چھپا ہے، مگر ہر بار کتابت کی غلطیوں کا اس میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ ایک یہ بات بھی ہے کہ آپ اس اشاعتِ اوّل کی کتابت پر نظر ڈالیں تو آنکھوں میں نور اُتر آئے گا۔ اب اکثر و بیشتر ایسی کتابت سامنے آتی ہے جس کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس سے تو وہ پتھر کا زمانہ اچھا تھا۔ اناڑی مزدور بھی اب راج بن کر دیوار کی چنائی کرنے لگتے ہیں، اس بھروسے پر کہ اوپر سے سیمنٹ کا پلاسٹر سارے عیبوں کو چھپا دے گا۔ وہی احوال آفسٹ کی طباعت کا ہے، کہ آدمی سمجھتا ہے کہ کیسی ہی کتابت ہو، آفسٹ کی چھپائی میں آکر سب عیب چھپ جائیں گے۔ یوں اُردو اکادمی، دہلی نے یہ نہایت مناسب فیصلہ کیا کہ حالی کے اِس دیوان کی اشاعتِ اوّل کا عکس شائع کیا جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے، ایک تو یہ کہ نئی غلطیوں کا اضافہ نہیں ہو سکے گا اور دوسرے یہ کہ کتابت کا حُسن برقرار رہے گا۔ بات یہ ہے کہ اِس دیوان کی کتابت جن صاحب نے کی تھی، اُنھوں نے صرف دو سال یا تین سال میں، کسی ادارے میں کتابت نہیں سیکھی تھی، عُمر کا اچھا خاصا حصّہ اصولوں کو سیکھنے سمجھنے میں صرف کیا تھا۔

میں ڈاکٹر خلیق انجم اور جناب شریف الحسن نقوی کا ممنون ہوں کہ اِن صاحبوں نے یہ چند صفحے لکھنے کی عزّت مجھے بخشی۔ اور اگر یہ چند صفحے غلطیوں سے محفوظ رہ سکے اور ذرا قاعدے سے چھپ سکے تو اس کے لیے اپنے محبِّ صادق الود اد مخمور سعیدی صاحب اور عزیزِ مکرّم انتظار مرزا صاحب کا شکریہ ادا کروں گا۔

۱۱ر مارچ ۱۹۸۶ء — رشید حسن خاں

دُر مع الدهر کیف ما دار

جس رُخ زمانہ پھرے اوسی رُخ پھر جاؤ

مقدمہ

جسمین شاعری کی ماہیت اور اوسکے حسن و قبح پر مفصل بحث کی گئی ہے

مع

دیوانِ حالی

مشتمل بر قطعات و غزلیات و ترکیب بندات و رباعیات وغیرہ

مصنفہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی مقیم مدرستہ العلوم علی گڈھ

سنہ ۱۸۹۳ء

مطبع انصاری واقع دہلی مین چھپکر

ٹائٹل پیج

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور مین چھپا

حسب ضابطہ رجسٹری ہو گئی ہے

قسم سوم فی جلد عہ

دیوان حالی

جس میں قطعات - غزلیات - قصیدے - مرثیے
ترکیب بند - رباعیاں - تاریخیں - اور
اور متفرق اشعار شامل
ہیں

قطعات

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے — کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط — کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی؟ جو بے ہاتھ لگائے — دے یونہیں چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے، جتنے خط تھے بڑے — اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
جب نہ رہا واں پیش نظر — خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اٹھا کر آنکھ جدھر — تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہے یارو بات کہ تھی — قوم میں باقی جان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب — آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں — افضل و اعشیٰ کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت — جن پہ کہ نازاں تھی انشا
شعر میں تھے استاد اکثر — سحر بیاں اور نکتہ سرا

لے گئی اُن کو آخر کار — بحرِ فنا کی موج بہا

اہلِ ہنر کا نام و نشاں — قوم میں جب باقی نہ رہا

حالی و زیدہ و عمرو بنے — صاحبِ دیواں نامِ خدا

اب چاہو۔ اُستاد گنو — یا ہمیں سمجھو تم یکتا

ہم ہیں وہی ناچیز مگر — گَبُرَ نَاموتُ الکُبَرا

شعر کی طرف خطاب

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے۔ جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو

حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو — آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز — دھوکے کا غرق کر کے رہیگا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری — قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو

اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز — جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ — معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو

چُپ چاپ اپنے سچ کیتے جا دلوں میں گھر — اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو

جو نا بلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے رہ — گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

بلد واقف، اور نابلد ناواقف

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا　　محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا　　اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل　　بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بیقدریوں کے بعد　　اسکے خلاف ہو تو سمجھ اُسکو شاذ تو
جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ　　حالی کو تجھ پہ ناز ہے۔ کر اُس پہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر۔ حیف　　طبع رنگیں تھی مَے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں　　جو غزل لکھتے تھے۔ ہوتی تھی سراسر حالی
اب۔ کہ الفت ہی نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ　　سر ہے سودا سے تہی۔ عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا۔ لکھیے غزل میں آخر　　نہ رہی چیز وہ مضمون سو جھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو۔ ہے وہ کہانی بے لطف　　گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں　　لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر　　کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح　　وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل　　"محتسب چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی"

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں
جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے

کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلیغ
اسمیں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے

دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا
اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے

اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

بے تمیزیِ ابنائے زمان

از رہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا
ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم

جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونیکا غم

دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا
امتحاں کے وقت کھلجاتا ہے سب تیرا بھرم

مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا
گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم

مجھ میں اور تجھ میں مگر کرسکتے ہیں جو تمیز
ہیں مبصر ایسے اس بازار ناپرساں میں کم

تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیر زادہ کو
تھا خدنگ فگنی کا شوق کہیں

خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں۔ وہ اسمیں بھی سب تھیں

گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی
اسپہ تھا خود پسند اور خود بیں

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ علم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سنتے سنتے یاروں کی ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشق تیر افگنی میں تھا مصروف کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کمان سے چھوٹے پائے سب بے اصول و بے آئیں
جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا تیر آ جا جگہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھٹ کے سوئے شمال ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تودے پہ جا کے ہو بیٹھا لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چلّا کر کوئی تجھکو جنوں ہوا ہے سکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے یا کہ دو بھر ہی تجھکو جان حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے ان بے پناہ تیروں کی کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھکو ہر پھر کے شش جہت میں حضور امن کی اک جگہ ملی ہی یہیں

پولٹکل سپیچین

اے بزمِ سفیرانِ دُوَل کے سخن آرا   ہر خُرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہی
یہ سچ ہی کہ جادو ہی بیاں میں ترے لیکن   کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہی
ظاہر ہی نہ غصہ میں بیاں سے تری رنجش   نہ لطف میں کچھ طرزِ بیاں اُس سے جدا ہی
ہی دلمیں نہاں ایک شکایات کا طومار   اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہی
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سی شیریں   اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اُس سے سوا ہی
گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں سخن کے   اور سُنیے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہی
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات   گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانیے کیا ہی
کُھلتا نہیں کچھ اسکے سوا تیری بیاں سے   اک مرغ ہی خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہی
تھے لب پہ ترے اظہار پہ اب کے کُھلا یہ   انسان کو اخفا کے لیئے نطق مِلا ہی

بدی کر کے نیکنامی کی توقع رکھنی

نامنصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم   برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت
جب دورہ کو اُٹھتا تھا تو دیہات میں جاکر   تھا پوچھتا ایک ایک سے از راہِ شرارت
ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا   کرتے ہیں ہماری وہ ستایش کہ مذمت
تھی اُسکی مثال ایسی کہ اک شخص بدآواز   جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے   ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سُرعت
ہو تا کہ یہ معلوم کہ ہی دور سے میری   آواز خوش آیند و یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا "زینت و اسباب پہ جو لوگ — اتراتے ہیں۔ اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"
حالی نے کہا "جنکو ہے اترانے سے نفرت — اترا کے وہ اسطرح نہیں ناک چڑھاتے"

سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں — بعض کے نزدیک توحید اُسکی حدِ تام ہے
ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول — جو ہیں قائل اسکے اُنپر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اُس حق کو عام — جس سے غیر از اہل قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ "شر ہے تیرے سب آئین پر — بس مسلمانی و دیں داری اسیکا نام ہے
پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عند الفحول — کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے
اُسی کا مستحق ہے خاصکر اپنا گروہ — اور سبّ کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہی لباس — جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ — حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے
مذہب منصور٥ ہے لیکن بیاں کرنا ضرور — جو مسلّم آج کل نزدیک خاص و عام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر — سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

٥ اقوال مختلفہ میں سے جو قول راجح ہو اُسکو مذہب منصور کہتے ہیں۔

قرض لیکر حج کو جانے کی ضرورت

قریب موسمِ حج۔ قرض لیکے اک دیں دار
چلا بہ نیتِ حج۔ گھر سے سوئے بیت اللہ

کہا یہ اُس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت
کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ

نہ نان و نفقۂ فرزند و زن سے خاطر جمع
نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ

سُنا یہ۔ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
کہ روکتا ہے مُسلماں کو حج سے اے گمراہ

وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی
پہُنچتے جو کہ ہیں طے کرکے بر و بحر کی راہ

جنھیں فراغت و تنگی میں ہے اُسی سے اُمید
جنھیں سلامت و آفت میں ہے اُسی کی پناہ

وہ سُن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
اُمید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ

ذلیل ہوتے ہیں جو بن بُلائے جاتے ہیں
طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ

یہ سُن کے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر کہ کہیں
ہو مدعی نہ تجسس میں یہاں کوئی ہمراہ

بُلا کے پاس پھر آہستہ اُس سے فرمایا
ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ

قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
جوانِ خام کی وہاں تک نہیں پہنچتی نگاہ

خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر
فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطر خواہ

نماز و روزہ ہو۔ یا ہو طواف و عمرہ و حج
حصول جیسے کہ ہوتا ہے اُنسے قربِ اللہ

اِسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام　　نہ جن میں چاہیئے محنت نہ کوششِ جانکاہ

مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے۔ ورنہ　　ہزاروں پھرتے ہیں مُحتاج سادہ لوح تباہ

یہ کہنے سُننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار　　وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا۔ حاصل ہے آزادی جنھیں　　قدرداں اُنسے بہت بڑھکر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں　　قدر آزادی کی جتنی ہمکو ہو اُتنی ہے کم

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا　　بینوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم

تُعرَفُ الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم　　دیگا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

سُن کے ایک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا　　ہے سقر۸ موری کے کیڑے کے لیئے باغِ ارم

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں "آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس　　یہاں غلام آکر۔ کرامت ہے یہ انگلستان کی

اُس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہیں رکھا قدم　　اور گِنکر پانو سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی"

قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا　　کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی

آن کر آزاد یہاں آزاد رہ سکتا نہیں　　وہ رہے ہوکر غلام۔ اِسکی ہوا جنکو لگی

۸ یعنی جسطرح موری کے کیڑے کو موری ہی میں آرام ملتا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا اسیطرح جو قومیں ہمیشہ محکوم رہتی چلی آئی ہیں۔ وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں

سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ کس لیئے سید سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اُسکو ٹھیراتے ہیں آپ ثابت اسلام اُسکا۔ نزدیک آپ کے گویا نہیں
آپ بھی (نام خدا) ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں
خود نبوت پر سُنے ہیں ہمنے ایراد آپ کے اور اُلوہیت سے بھی دل۔ جمع حضرت کا نہیں
چشم بد دور آپکا بھی جب کہ ہی مشرب وسیع پھر یہ سید پر تبرا آپ کو زیبا نہیں
سُن کے فرمایا "اگر ہو پوچھتے انصاف سے بات یہ ہی۔ سُن لو صاحب تم سے کچھ پردہ نہیں
رنج کچھ اسکا نہیں مجھکو کہ وہ ایسا ہے کیوں بلکہ ساری کوفت ہی اس کی کہ میں ویسا نہیں

قحط اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری جو تھا سو چشم پُر نم۔ اپنا تھا یا پرایا
"دُنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق" یہ کہکے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہمنے کہا۔ مریدی باقی رہی نہ پیری یہ کہکے ہم بھی روئے اور اُنکو بھی رُلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنیکا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر درگذر بھی اور نہ ساتھ اُن کے رعایت تھی کہیں

بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف — کام سے مُہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار — ذکر کیا۔ نکلے جو چھوٹے مُنہ سے اُسکے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھی جب اُس سے چُوک — نتھنے پھولے۔ مُونہ چڑھا۔ ماتھے پہ بل ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیئے کوئی فتوح — آ کے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
رہتا تھا اِک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس — فرض جسمیں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار — زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں
حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں — تاکہ یہ درخواست۔ دیکھیں وجہی ہے یا نہیں
وھاں سوا تنخواہ کے۔ تھا جس کا آقا ذمہ دار — تھیں گرہیں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں
دیکھکر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب — تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں
ایک دن آقا تھا اک مُنہ زور گھوڑے پر سوار — تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار — اور گرا اسوار صدرِ زیں سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش۔ نہ چھوٹی پانو سے لیکن رکاب — کی نظر سائیس کی جانب۔ کہ ہو آکر معیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگدل اور بے وفا — دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں
دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا — دیکھ لو سرکار اسمیں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے — اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب

کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم
زباں جسکی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہو
نہیں جو رائے میں اپنی مُذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جسمیں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اِس کی نہ ہو مفہوم اُس کو
ہوں آدم تک جُدا سب کے جد و اَب
جو وحدہ لاشریک اُس کا خدا ہو
تو لاکھوں اُس کے ہوں معبود اور رب

صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گذرا کہیں میلا کچیلا اک غلام
اُسکے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُسکو کی
عرض کی "ایک اک رواں ہو جس بدن کا ملکِ غیر
اختیار اُسکی صفائی کا نہیں رکھتے رہی"
جو۔ مدیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسم آدمی ہیں۔ پیشِ اہلِ معرفت
کوئی چیز اُسکی نہیں سب ہے امانت گور کی

دلّی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالی کے کہا از رہِ انصاف
"کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اُسکے سخن کو"
چند اہلِ زباں جن کو کہ دعوٰے تھا سخن کا
بولے کہ "نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اُس کے دہن کو
معلوم ہے۔ حالی کا ہے جو مولد و منشا
اُردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو

اُردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے — پنجاب کو مَس اُس سے نہ پورب نہ دکن کو
بُلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے — کیا عالمِ گلشن کی خبر زاغ و زغن کو
حالی کی زباں گر بمثل نہرِ لبن ہو — خالص نہو تو کیجے کیا لے کے لبن کو
ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ — پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو
مانا کہ ہے بے ساختہ پن اُسکے بیاں میں — کیا پھونکیئے اِس ساختہ بے ساختہ پن کو
یہ دوست نے حالی کے سُنی جبکہ تعلّی — حق کہنے سے وہ رکھ نسکا باز دہن کو
کچھ شعر تھے یاد اُنکے پڑھے اور یہ پوچھا — کیوں صاحبو عزت ابھی اُردو سے ہی فن کو
سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے — کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے — پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب — کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ سے گود سے لیکر ماں کی — گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جاکر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن — جو کہ اندھے ہیں ہیے کے نہیں کچھ انکو خبر
لوگ بیٹی کے لیئے ڈھونڈھتے ہیں جب ہونڈ — سب سے اول اُنھیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
ایسے گھر بیاہیے بیٹی کو جو ہو آسودہ — اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں ہمہ میانہ کے سارے زن و مرد — اُنکے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر

ایک ہی شہر میں ہوں دونو گھرانے آباد — دونو۔ نزدیک قرابت میں ہوں باہم گر
بیٹھتے جی مرگئی بس اُن کی طرفسے گویا — جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر
چھان بین اسکی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہے — پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر
بدمزاجی ہو جہالت ہو۔ کہ ہو بدچلنی — کچھ بُرائی نہیں۔ ذی ثروت ہو داماد اگر
وہ بھی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن — بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں — گاڑ دیجاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی — زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام — جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے — برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا — لیکن نہ اُسکے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی — تدبیر یہ بھی اُسکی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اُسنے کیئے سیکڑوں جتن — پر کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری
راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت — اِک خضر پے خجستہ نے کی آکے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اُسکے کہ آج کل — سنتا ہوں چھپ رہی ہیں تصانیف احمدی
جا۔ اور لفظ لفظ کو اُسکے چھیڑ کر — تردید اُسکی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی

پھر دیکھنا کہ رسن وچپ گرزو پیش سے
لگتی ہے کیسی آ کے زر وسیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیئے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہو ابلہی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست
دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا

جی میں ترے ہزاروں گذرتے ہیں وسوسے
ہوئی نہیں قبول تری ایک اگر دعا

تجھسے ہزار مرتبہ بہتر ہے بُت پرست
جس کا یقیں ہی تیرے یقیں سے کہیں سوا

وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر
گو حاجت اُس کی اُنسے ہوئی ہے نہ ہو روا

آتا نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور
اُمید اُس کی روز فزوں ہو اور التجا

تو بندۂ غرض ہے۔ وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجیئے بھیک دوڑ کر۔ گُر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے

ہے یہی اصل اکتساب۔ ہو جئے سب سے مستفید
زک ملے۔ یا سزا ملے۔ درس ملے۔ ادب ملے

لایق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے
فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول اک حکیم کا ہے کہ "گر غور کیجیئے
ہے حق میں سب کے دوست کے دشمن مفید تر

اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب سو سو طرح سے وہ اُسے کرتا ہی جلوہ گر
دشمن سے بڑھکے کوئی نہیں آدمی کا دوست منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال رکھتا ہی جو کہ دوست کے عیب اُس سے مستتر
گو قول ہی متین یہ جو تھی سخن کی تہ افسوس ہی حکیم کی پہنچی نہ وہاں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید عیب اُنکے دوست کیوں نہ جتائینگے بیخطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سُن سکتے اپنے عیب وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہونگے بہرہ ور
جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یہاں موقوف عبرت اُنکی نہ دشمن نہ دوست پر

سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اُسکو
موجود سخنگو ہوں جہاں وہاں ہیں طبیب آپ اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں ہیں سخنگو
دونوں میں سے کوئی نہو تو آپ ہیں سب کچھ پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں اپنے دعووں پہ بیاں کرکے دلیل و برہاں
مغلوب

عبرت = اعتبار نصیحت حاصل کرنا ۱۲

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی | دردہیں تیرے۔ اسی واسطے سب بے درماں
ہے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی | جسکا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں
سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز | تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں
نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر | یہ بھی ہے نیند کوئی۔ موت کا ہی جسپہ گماں
نہ جوانی میں تجھے صبر۔ نہ پیری میں شکیب | کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں
کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو | دیکھ۔ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں
ہاتھ دھو لذتِ فانی سے۔ نہیں گر منظور | عیش باقی و حیات ابدی سے حرماں
نفس نے عقل سے کی عرض کہ ای خضرِ طریق | وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجئے جاں
پر نہیں حکم ترا کوئی۔ عمل کے قابل | گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں
نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی امید | کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں
ہے یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا | سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جسپر قرباں
ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ لے قابِ طعام | ایک مدعو اسے کرتا ہے پس از سال رواں
کیونکہ امید پہ اک مائدۂ نعمت کی | سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں
عقل نے سن کے کہا خوف ہے تجھسے ای نفس | جز بزہ تیرا تجھے دیکھیے پہنچائے کہاں
حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل سرسبز | کیجئے لاکھ بیاں اسپہ دلیل و برہاں
جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر | زہر دانستہ کرے نوش۔ نہیں یہ امکاں
نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد | اسکے کھانے میں نہیں جاں کی خیر ای ناداں

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا　　گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جا
ہنسکے عادت نے کہا کیا عقل ہو مجھسے الگ؟　　میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و را

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہو رائے　　چاہیے گر رونقِ علمِ زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجے رُکن　　جن پہ اُسکی سب رکانیں ہیں عیاں"
رائے صائب ہی بظاہر اور متیں　　گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ　　ہی بہت کم پر خلاف اسکے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہی جب　　شاعروں کے ہاتھ ہو اُس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے　　شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر اُن میں سے چل سکتا نہیں　　دوسرے کا جادوے حسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی　　پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

لوگ کسی کی خوبیاں سُن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اُسکے عیب سُن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں حالی　　اُسقدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار

لوگ جب عیب ہمارا کوئی سن پاتے ہیں
گو کہ کرتے ہیں تاسف کا بظاہر اظہار

پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو رنج اُن کو کمال
گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار

اور جو ہو گوش زد اُن کے کوئی خوبی اپنی
خوش تو پڑتی ہے بنانی اُنھیں صورت ناچار

دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم اُنکے
کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار

للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا
نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ طیار

شایستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال
انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا

مدت تک اُسکی جب یہی دیکھی گئی روش
پوچھا کسی نے اُس سے کہ اسکا سبب ہے کیا

بولا کہ عادت اسلیئے کی ہے یہ اختیار
چھُٹ جائے تا کہ مجھسے یہ لپکا سوال کا

پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک
آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا

پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدا
منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا

امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت
گر چند روز اور رہا ان سے سابقہ

آیا جواب سن کے یہ اسکا بہت پسند
کی آفریں اور اُس سے مخاطب نے یوں کہا

نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ
حق میں ترے مفید ہیں یہ اُنسے بھی سوا

انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل
اہل وطن پہ اُن کی مگر جان ہے فدا

پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ
دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پسیجتا

انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ شایستگی کا زہر ہے جب سے انھیں چڑھا

اسراف

ایک مُسرف نے یہ مُمسک سے کہا کب تک اے ناداں یہ حُبِ مال و زر
تو - جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر؟
ہنسکے مُمسک نے کہا اے سادہ لوح زر لُٹانا رائگاں اور اسقدر؟
آج ہی گویا (نصیب دشمناں) آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

پاسِ نیکنامی

اے نیکنام شکر کر اللہ کا ادا جسنے بنایا نیک تجھے کر کے نیکنام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نامِ نیک کا پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھکو خوفِ خدا کا ہو اسقدر جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرورِ نیکنامی

گئی ہے حد سے گذر شیخ کی نکونامی گمانِ بد کبھی اُس کی طرف نہیں جاتا
جو اُسکے عیب شتم سے بیاں کرے کوئی خود اُسکو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کا مڈیکل امتحان

دو ملازم - ایک کالا اور گورا دوسرا دوسرا پیدل - مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونو رواں کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونو کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت کوکھ میں کالے کی اک مُکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی آکے گھوڑے سے لیا سائیں نے اُسکو اُتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جاکے دونو پیش وپس ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونو کی سُنی جب سرگذشت تہ کو جا پہنچا سخن کی سُن کے قصہ ایکبار
دی سند گورے کو لکھ - تھی جسمیں تصدیقِ مرض اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مُکے سے مرے کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے "تمکو مل نہیں سکتی سند کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا اُپٹ کے جو گورے سے فوراً مر نجائے آے بابا اُس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

خودستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خودستا نہیں پر خودستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیورِ خرد سے مُعرا ہیں سادہ لوح کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو اُن سے تیز ہوش ہیں، سو سو طرح سے وہ — پردوں میں یہ کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
کہتا ہی ایک کیسی حماقت ہوئی ہی آج — کمبل تھا ایک گھر میں، سو سائل کو دیدیا
کہتا ہی دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل — سائل کی ڈب میں میں نے دیا مال جب دکھا
پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ — اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا
کچھ۔ اسلیئے کہ ہم بھی انھیں میں سے ہوں شمار — اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ۔ اسلیئے کہ اپنا ہو انصاف آشکار — کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی — ہی عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی — پر جانتے آدمی کو ہیں کہہ کے ہم برا
دھوکا ہنر کا دیکے چھپاتا ہے عیب یہ — اور مونہ سے دُرد کہکے دکھاتا ہی وہ صفا
چُپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں — یعنے کہ یہ بیان ہی سب رہت اور بجا
کہتا ہی اسپہ کوئی کہ سب حسن ظن ہی یہ — اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
قانع ہی وہ انھیں پہ۔ ہوئی وصف جو بیاں — اور چاہتا ہی یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
کہتا ہی زید۔ عمرو ہی شدت سے سادہ لوح — گنتا ہی سب کو نیک وہ۔ اچھا ہو یا برا
کہتا ہی عمرو۔ زید بھی کتنا ہی عیب بیں — بد ہو کہ نیک۔ اسکی زباں سے نہیں بچا
یہ اسکا اور وہ اسکا بیاں کرکے کوئی عیب — ہر اک ہی اپنی اپنی بڑائی نکالتا
غیبت۔ امید ہی کہ نہوتی جہان میں — ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا
حالی۔ جو پتے کھل رہے ہیں جہان کے — شاید کہ اس سے آپ کا ہو گا یہ مدعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب   اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القصہ جسکو دیکھیے - جاہل ہو یا حکیم   آزار میں خودی کے ہی بیچارہ مبتلا

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے   گر کبھی حملہ پہ اُسکے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی   جن کو نادانی سے حملے اُسکے ٹھیراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال   زور بازو پر ہمیشہ جسکے اتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہو اُسمیں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا   جب کرتے ہو تم کرتے ہو مُسرِف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور   جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے - پر بخل سے کمتر   ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا   یاروں کے لیئے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُسوقت   جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر   پھر اُسمیں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال   گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی   پرواز کی ہے چیونٹوں کو جیسے ہدایت

رؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت — بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا
بولے آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر — عاملانِ شہر مدعو اُسکے رہتے ہیں سدا
ضلع کے حکام کا ادنے اشارہ چاہیئے — پھر کوئی دیکھے سخاوت اُس کی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں — اُنمیں صرف اُس کی رقم ہو سب کے چندے سے سوا
پالکی یا وگینٹ۔ ہو جو سواری اُسکے پاس — اہلکاروں کے لیئے ہی وقف بے چون و چرا
کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس — اُس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے لوث و ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام — جوڑ کر ہاتھ۔ اُنسے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اُس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں — سُنتے سُنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ایمان کی تعریف

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف — تو دی چراغ سے اُسکو بہ آب و تاب مثال
کہا "فتیلہ اقرار باللساں ہے ضرور" — جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا ہے اِن دنوں اک تیل؎ — نہیں ضرور فتیلہ کا جسمیں استعمال

؎ یعنے کروسن آئل جو بغیر بتی کے بھی جل سکتا ہے۔ گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے ۱۲

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جنمیں ملاپ — دولت و بخت ہے ہر حال میں اُنکے ہمراہ
نہ اُنھیں حاجتِ اعواں۔ نہ تلاشِ انصار — نہ اُنھیں خوفِ بداندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی — اُنکی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ
نہ ملاذ اُنکے لیئے قلعہ نہ خندق نہ فصیل — نہ مفید اُنکے لیئے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک مُلا نے سُنا جب یہ سخن فرمایا — تکیہ اور اسقدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں — دستِ قدرت کے ہیں سب ہاتھ سفید اور سیاہ
وھاں نہ ملت کی ضرورت ہی۔ نہ کچھ پھوٹ کا ڈر — پڑگئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر — کردیں افرادِ پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہی اللہ کی عادت معلوم — اُسکو جب دیکھا ہے۔ دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صوری مانعِ قربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیئے شہر میں اک گھر — جا اپنے محلہ سے کہیں دور بنایا
جب اہلِ محلہ سے چلا ہو کے وہ رخصت — دل سوزِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس — اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
بلی کہ جو بے عقل ہے۔ دم دیتی ہے گھر پر — اتنی بھی محبت تمھیں گھر سے نہیں آیا!

حالی نے کہا "اُنس ہی چیز اور ہے وفا اور
بلّی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا
اُس مہر و وفا کی نہیں بلّی پہ پڑی چھینٹ
کُتّے نے ہے جس کا کہ سبق ہمکو پڑھایا
ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم تو نہیں تمکو بھلایا
گھر دل میں ہے یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

ناصحِ مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفرِ صادق سے عرض کی
"محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا "ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جسکو ہے امیدِ نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کرینگے تری حذر"

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خُدام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
"کوئی آقا جبکہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اُسکے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا"
پر جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اسکی کہ ہے خود خلق آقا کا بُرا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جسنے اور تمکین کو
اُسنے گویا ڈھا دیا رُکن رکیں اخلاق کا

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل کا تیر جب چڑیا پر　　ہو گیا اتفاق سے جو خطا
ابن حمدوں ندیم تھا حاضر　　کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
"جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے　　خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچکے تیر سے وہ　　تو نے دی قصداً اُسکی جان بچا"
ابن حمدوں نے کی یہ دانائی　　کہ خوشامد سے یوں اُسے تھپکا
دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے　　ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
جائے کنجشک ابن حمدوں پر　　تیر کا اپنے امتحاں کرتا
ابن حمدوں کی جان گو جاتی　　دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیت پر نااہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اسکے　　"فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطۂ ملعوں تھا یہی جسکی بدولت　　تھا دل میں خدائی کا خیال اُسکے سمایا
میں بھی اسے اُس باغیِ طاغی کے علی الرغم　　اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا"
کہتے ہیں خصیب ایک غلام حبشی تھا　　جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنتِ مصر کی باگ اُسکے حوالے　　نااہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
باڑی گئی یہ ایک برس نیل کی رَو میں　　یہ حادثہ آ اُسکو کسانوں نے سُنایا

فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اُون ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اُٹھایا
ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا اپنے کو خدا جسنے ہے عالم کو بنایا
جوکھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی اک سفلۂ ناکس کی بنا اُسکو رعایا

رشک

ظاہرا مردوں کی طینت میں نہیں رشک اسقدر ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں
ایک شہزادی۔ کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی تختِ شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں
سلطنت میں اُسکی۔ تھا مردوں کو کلّی اختیار عورتیں اصلا دخیل اُس کی حکومت میں نہ تھیں
مرد ہی تھے اُسکے محرم۔ مرد ہی اُسکے مشیر تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اُسکے کہیں
تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم ہنسکے فرمایا کہ "اے دولت کے ارکانِ گزیں
مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں بلکہ ہے اُنس اسلیئے تم سے کہ تم عورت نہیں"
بات کی حسنِ بیاں سے اُسنے دی صورت بدل تاکہ کوئی سوءِ ظن اُسپر نہ کر بیٹھے کہیں
ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے اسلیئے نفرت۔ کہ ہے مردوں کی صورت دلنشیں

قانون

کہتے ہیں ہر فردِ انساں پہ یہی فرض ماننا قانون کا بعد از خدا

پر جو سچ پوچھو۔ نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا

اُس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا

پر اُسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں
جو کہ قوت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا

حق میں کمزوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زورمندوں کی ہے لا

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو
تختِ پدر پہ اُسکو ممنوع ہے بٹھانا

قانون ہے بنایا یہ اُن مقننوں نے
عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا

لیکن اگر یں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی
کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا

نزدیک اُنکے گویا بر زعم عقل و دانش
ہے کنگڈم سے آساں ہیٹ م کو بس میں لانا

حرص

اثنائے وعظ میں تھی تکیہ کلام واعظ
قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیا

گویا کہ حرص اُنکی اس سے بجھی نہیں ہے
ہے جسقدر فراہم پاس اُسکے مالِ دنیا

اُمرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت

پر۔ اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت
بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبا بیمار کو کچھ اس سے سوا اُن کی ہے حاجت

عصمتِ بی بی از بے چادری

اے بینوا ؤ ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم اخلاق میں کچھ اُن کے اگر آگیا بگاڑ
تم زد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے ہو جب تلک کہ پڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش گر تم کو ہوں نصیب تو دنیا کو دو اُجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے دیکھ لو جا کے خزانوں میں کُتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ باز پرس اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آآ کے جو لوگ تمہاری ہر دم اے اربابِ دولت

خوشامد پر نہ اُن کی بھولنا تم — وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہمنے بیاں کیں خصلتیں نیک — نہیں اِن میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیرِ قیامِ سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح — وھاں پانو جمانے کے لیئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اِسکے تھی یہ مشورہ دیتی — یہ حرفِ سبک بھول کے مونہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر — مانو اُسے۔ اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو۔ لیکن — جو بات سبک ہو اُسے مونہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر — مردوں کی حکومت میں ہی ملکوں کی بُری گت
لیکن بخلاف اسکے۔ ہے عورت کا جہاں راج — وھاں ملک ہی سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار — قبضہ میں ہی وھاں عورتوں کے دولت و مکنت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسرِ شاہی — سمجھو کہ ہے اُس مُلک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عَمرو — تو سمجھو۔ کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار

جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا ۔۔۔ بُرائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

کام اچھا کرنا چاہیئے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے ۔۔۔ اُسنے کی تاخیر اُسنے جسقدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں ۔۔۔ بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

گدائے مُبرم

اک برہمن موتی کے سامنے باصد نیاز ۔۔۔ مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں
آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا اُدھر ۔۔۔ دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں
جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے ۔۔۔ تاکہ پوچھے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں
موتی کے سامنے جب کرچکا وہ التجا ۔۔۔ بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں
موتی کچھ تجھکو دے گی اور نہ دیکھتی ہے وہ ۔۔۔ ناحق اتنی التجائیں اُسکے آگے تو نے کیں
ہنس کے برہمن نے کہا "ہے مانگنا بندہ کا کام ۔۔۔ دے۔ نہ دے وہ۔ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں
ہم نہیں دیتے ڈھنی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح ۔۔۔ ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانو پھیلاتے نہیں

نئے اعتدالی

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو ۔۔۔ ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کر

نہیں کام کا تمکو اندازہ ہرگز — جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت — تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اُٹھو نہ جب تک — کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر — تو فرصت ملے شاید اب تمکو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو — کہ بس ٹھن گئے عزم جنگِ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر — تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہی تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو — کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی — رہیں پانو کے ہوش جسمیں نہ سر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو ات گت — غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہی ہر بشر کو ملال — کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے — تو اور بھی اُسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہی کہ ہوتے نہیں طبیب ملول — جو چل بسے کوئی اُنکے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ تھُپ جائیگی خطا ہم پر — کیا ملال کا اپنے گر اُسجگہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

ہ یعنی پیٹ بھر کے احمق۔ احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں گویا مخاطب کے سوا کسی پر اُسکی حماقت ظاہر کرنی نہیں چاہتے ۱۲

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی — پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اُس سے کارِ نمایاں کوئی اگر — کرتا ہے بار بار بیاں اُسکو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیئے — ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اِک جُدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُسکو یاد — یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھُولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہیئے — آخر بشر کا خاصہ ہے سہو اور خطا

فضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف — جہاں سے ہو کے گذرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش — سخی ہو ہمیں کہ مُمسک، غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولتمند — کہ جسکا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اُس راہ سے گذر اُسکا — درم اک اُسنے بھی چاہا کہ کیجے نذرِ فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت — کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر
پہ لونگا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار — کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اللّے تللّے رہے تو آپ کو بھی — ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہی یہی لینے کا خود بدولت سے — دکھائے دیکھیے پھر اسکے بعد کیا تقدیر

اختلافِ مذہب رفع نہیں ہوسکتا

غیر ممکن ہے کہ اُٹھ جائے دلیل و بحث سے — جو چلا آتا ہی باہم اہلِ مذہب میں خلاف

ہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ موردِ آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
دو ہیں اُنمیں سے نہایت جانگزا

ایک فکر اُس آنے والے وقت کی
شک نہیں ہے جسکے آنے میں ذرا

دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی
زخم جن کا زخم ہے تلوار کا

اور بھی حیوان ناطق کے لیئے
ہیں بہت سی زحمتیں انکے سوا

پر گدھے اور اَور حیوانات سب
رہتے ہیں دور۔ اِن گزندوں سے سدا

کیسا اِن آلام سے رہتا نچنت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام؟

بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام

آنکھ میں اپنے پرائے کی ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام

جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ بونا کوئی بیج
جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام

ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
نفس سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اس زہر ہلاہل کا کوئی بھول کے نام

یہ تو کہتے ہو کہ انجام بُرا ہے۔ لیکن
یہ بتاؤ کہ بُرا ہوتا ہے کیسا۔ انجام؟
بُرے انجام کی تب ہوگی حقیقت روشن
بُرے انجام سے جب آکے پڑیگا خود کام
مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس اِن لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کسقدر
چاہتے ہیں۔ نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو
گو کہ اُنکے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ رہ جس کے کبھی چاکو نہ لیں
اُسکا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو ملتے لینی پڑتی ہیں انھیں
اُنکو لندن سے منگائیں بس چلے اِنکا اگر
الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا۔ قصہ مختصر
سُن کے حالی نے کہا "ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہی ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبع بشر
مکھیاں جیسی نکلجاتے ہیں پاسِ قوم میں
اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر
ہاں۔ بری اس عیب سے لے دیکے اس دنیا میں ہے
چشم بد دور امت مرحوم اے جانِ پدر
اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ۔ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یہاں
جسقدر ہے اِنسے اپنوں اور یگانوں کو خطر

غزلیات قدیم و جدید

چونکہ بہت سی ردیفیں قدیم غزلیات میں اور بہت سی۔ جدید غزلیات میں نہیں تھیں۔ اسلیئے ہر ایک ردیف میں دونوں قسم کی غزلیں ملا جلا کر لکھ دی گئی ہیں۔ اور تمیز کے لیئے ہر قدیم غزل کے شروع میں حاشیہ پر حرفِ ق لکھدیا گیا ہے تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ قدیم و جدید غزل میں کیا فرق ہے؟

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا — اک بندۂ نافرمان ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا — بندے سے مگر ہوگا حق کیونکہ ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم — کچھ کہہ نسکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

چھپتا نہیں نظروں میں یہاں خلعت سلطانی — کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

قطعہ

۱ عظمت تری ماننے بن کچھ بن نہیں آتی یاں — ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

۲ تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط اُن کو — جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

۳ نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بجود — جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

۴ سمجھا ہے پرے تجھکو ادراک کی سرحد سے — جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

۵ طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہی گو بڑھکر — عصیاں میں ہی طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری — گھر گھر لیئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گذرتا ہے
کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

---

۸ یہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف " اَلَا اِنَّ ہٰؤلاء تحابّوا فی اللہ خیر الاخیار صوتہ " یعنی خلق کی خوشبوئیں زمانہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سو انکا آگاہ ہونا انکو ایک برابر ہو جاتا ہے ۲

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا	باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ	ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی دُگدا میں ہی طبیعی	جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی۔ پر دل بندھے ہوئے ہیں	ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یہاں ٹالتے رہے ہیں	لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی	پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
اُنکی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی	آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان۔ تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے	دل ہی سو چیز تیری۔ جاں ہے سو مال تیرا
ہی پورِ زال سے دل اُس کا قوی زیادہ	رکھتی ہے آسرا یہاں جو پیرِ زال تیرا
ہی پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی	یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سُن سُن کے سر دُھنینگے قال اہل حال تیرا

رہبر میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اِس نشے میں خمار دیکھا
نہ جی رُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یہاں اُنھیں بھی امیدوار دیکھا
رُخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں

نہ بلبل و گل ہیں وھاں تعلّق نہ سرو قمری میں پیار دیکھا

سوارِ محمل کی جستجو میں ہزاروں دشتِ طلب میں دوڑے

نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اُٹھتا غبار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھُلا بھی قسمت سے بھید تیرا

مِلا نہ کھوج اُس کا پھر کسیکو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پر خطر سے

گئے وہ کود آنکھ بند کرکے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

بچے ہوئے کاہشوں سے یہاں کی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں

وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا

چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے

گل اُنکی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے، کیسا ہے۔ کون ہے۔ اور تو کہاں ہے

پہ اپنے میں اور تجھ میں ہمنے علاقہ اک استوار دیکھا

سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں

نہ اُنسے کچھ تیرا بیر پایا نہ اِنسے کچھ تیرا پیار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیئے ہاتھ باندھ سب کے

جنھیں تھا یہاں اختیار سب کچھ اُنھیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالیؔ تو ایسے جینے سے فائدہ کیا

ہمیشہ بیکار تجھکو پایا کبھی نہ سر گرم کار دیکھا

ق

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا — چھپتا نہیں جلال تمھارے شہید کا

مضموں ہی نقش دل میں لَدَیْنَا مَزِیْد کا — کونین سے بھریگا نہ دامن امید کا

قفل درِ مراد سب اکبار کھل گئے — چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دیکھا ہی ہمنے عالم رحمت کو غور سے — ہی شش جہت میں قحط دلِ نا امید کا

شرم کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں — انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

ہی نردبانِ جذبۂ توفیق درمیاں — یہاں امتیاز کیا ہی قریب و بعید کا

ہی آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ — خونِ جگر میں نشہ ہی جامِ نبید کا

تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے — یارب یہ روزہ دار ہی مشتاق عید کا

دوزخ ہے گرد وسیع تو رحمت وسیع تر — لَا تَقْنَطُوْا جواب ہی هَلْ مِنْ مَّزِیْد کا

حالیؔ کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں

لیگا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا مَلَکِیُّ الصِّفَات یا بَشَرِیُّ القُوٰے — فِیْکَ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّکَ خَیْرُ الْوَرٰے

تجھسے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باران سے خاک — خَلْقُکَ خَصْبُ الزَّمَان بَعْثُکَ مَحْیَا الْوَرٰے

---

8 قرآن شریف میں ہی " لَھُمْ مَّا یَشَآؤُنَ فِیْھَا وَلَدَیْنَا مَزِیْد " یعنی اہل جنت کے لیئے جنت میں جو کچھ وہ چاہینگے سب کچھ ہوگا اور اسکے سوا ہمارے پاس کچھ اور بھی ہی

دعوے روشن ترا ثابت بے بینہ — صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا
قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور — اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا
غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب — دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما
اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت — جیسے کہ ہنگام قحط قبلہ سے اٹھے گھٹا
شان رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں — گو دے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا
گلہ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو — گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا
دور پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں — انہیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا
راہب و قسیس و حبر رہ گئے دل تھام کر — دیکھ لے تیرا قدم ہمقدم انبیا
خاک تھی جس ملک کی مزرع شر و فساد — تو نے اسی کو دیا ارض مقدس بنا
تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب — جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا
چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت — تو نے کیا دام دام قرض سب ان کا ادا
تو نے کیا سر حق عارف و عامی پہ فاش — ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا
چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی — ایک کے چرکا لگا ایک کو گھائل کیا
حجت حق کر چکا دین ترا جب تمام — پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما
دیر ہوئے بے چراغ اور صلوات یہود — شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا
بجھ گئے آتشکدے بیٹھ گئے بتکدے — ہو گئی تثلیث ماٹ اور ثنویت فنا

دیر۔ راہبوں کا کلیسا۔ صلوات۔ یہودیوں کا کلیسا۔ ہبا۔ غبار ناچیز ۱۲ مجوسی جو دو خدا ایک خالق خیر اور ایک خالق شر یعنی یزدان اور اہرمن کو مانتے ہیں اس عقیدے کو ثنویت کہتے ہیں ۱۲

اُٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھانس
مزبلہ پر چند روز پاتی ہے نشو و نما

غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام
مل گئے اُٹھ اُٹھ کے سب خاک میں اہلِ ہوا

رہ گیا نامِ سجاح کذب میں ضرب المثل
اسود و ابن کثیر خوار ہوئے برملا

سلسلۂ انبیا ختم نہ ہوتا اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اُٹھا

آتے ہی چشمہ دیا تو نے کوئیں سے نکال
جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا

بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملّتِ بیضا خدا

تجھ پہ صلوٰۃ و سلام ربِ سمٰوات سے
روز و شب و صبح و شام قدرِ رسالت سے

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اُسکو گرا کے چھوڑا

راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقوٰے
جو گنج تو نے تاکا اُسکو لُٹا کے چھوڑا

جس رہگذر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر
صنعاں سے رہ رَو کو رستہ بھلا کے چھوڑا

فرہاد کوہکن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دو تو ہیں دلگداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے اُنکو رُلا کے چھوڑا

8 سجاح۔ ایک عورت مدعیہ نبوت کا نام ہے جسکا کذب عرب میں ضرب المثل ہے چنانچہ کہتے ہیں ھو اکذب من سجاح اور اسود عنسی اور مسیلمہ جسکی کنیت ابن کثیر ہے۔ یہ دونو بھی مدعی نبوت تھے جو آخر کار قتل کیے گئے ۱۲

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی — عقل و خرد کا تو نے خاکا اڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں دبتے ترے ہمیشہ — ہر معرکہ میں تو نے اُن کو دِلا کے چھوڑا؎

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش — شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا

اُسکے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

دیکھا اے اُمید کیجو ہم سے نہ تو کنارا — تیرا ہی رہ گیا ہے لے دیکے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے — اے آسماں کچھ اسمیں تیرا بھی ہے اشارا

میخانہ کی خرابی جی دیکھکر بھر آیا — مدت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضارا

اِک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے — اے زاہدو تمہارا اسمیں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھتے تھے ہم اول — آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبر یہاں — جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے — جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس اہلِ دیں بھی مانندِ اہلِ دنیا — خودکام و خودنما ہیں خودبیں ہیں اور خودآرا

اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر — اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ — سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی سے کام ہی یہاں فعلوں سے اُسکے کیا کام

اچھا ہے یا بُرا ہے پھر یار ہے ہمارا

؎ دِلانا از کشتی دِلانا یعنی پچھاڑنا۔ اکثر کشتی کا لفظ حذف کر کے صرف دلانا بولتے ہیں ۱۲

رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

الفت میں دمبدم کچھ لذت ہی بڑھتی جاتی
چھوٹیگا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمہارا

دلجو نہیں کوئی یہاں حیف اے صنم پرستو
دلکش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمہارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمہارا

دشتِ طلب کے رستو طے ہوگے کس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا

دو بینواؤنکو بھی کچھ جم کے جانشینو
بس جامِ جم ہمارا اور ملکِ جم تمہارا

روسی ہوں یا تتاری ہمکو ستائینگے کیا
دیکھا ہے ہمنے برسوں لطف و کرم تمہارا

کھولی ہیں تمنے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولینگے ہم تمہارا

ہوتے ہی تم تو بیدل کچھ رو دیے سوارو
ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملوگے
گذرا ابھی ہے یہاں سے خیل و حشم تمہارا

پھرتے اِدھر اُدھر ہو کسکی تلاش میں تم
گم ہے تمہیں میں یارو باغِ ارم تمہارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تمکو حالی
کچھ کرکے بھی دکھائے زورِ قلم تمہارا

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہے بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہرِ وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونو نہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بل میں تم اس زال فسونگر کی نہ آنا

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی
تھا آب بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھکے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سُنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جبدن ہو اسے چھوڑکے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی۔ نہ جاننا اُس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُسکو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سُنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعوے
یہ۔ کہدو۔ دعوی بہت بڑا ہے پھر ایسا دعوی نہ کیجیے گا

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہمکو
کرے وہ یاد۔ اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو

زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضدِ بے کمالی۔ نہیں ملاپ انمیں حرف گیرو!

جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد

پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

تمھارا تھا دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو

سلوک اُس سے کئے یہ تمنے تو ہسے کیا کیا نہ کیجیے گا

ہو عزمِ دَیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا | آتا ہی دور ہی سے ہمکو نظر گھر اپنا

قیدِ خرد میں ہتے آتے نہیں نظر ہم | وحشت رہیگی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیرِ مغاں سے ہو کر تب سُرخرو ملینگے | فضل و ہنر کا ہوگا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہی گر وہ تو ہی ہمارے ڈھب کا | ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی | کر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے | یہ ہی بضاعت اپنی اور یہ ہی دفتر اپنا

غیروں کو لینگے آخر اپنا بنا کے کیا ہم

اپنوں ہی سے ہی حالی کچھ دل مکدر اپنا

معنی کا تمنے حالی دریا اگر بہایا | یہ تو بتاؤ حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا

اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہو گیا جب آخر | خوابِ گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کسکو — اے عندلیبِ نالاں یہ تو نے گل کھلایا
ویراں ہے باغ تسپر پھولی نہیں سماتی — مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا
اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا — گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا
ڈرتے رہینگے اب ہم بے جرم بھی سزا سے — احسان اُسکا جسنے ناحق ہمیں ستایا
واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اُس سے بن نہ آیا
آیا نہ تھا کبھی یہاں گویا قدم خزاں کا — دو دن میں یوں پلٹ دی کسنے چمن کی کایا
تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسیں — تو ہمنے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی بچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہمکو اُن کا نشاں نہ پایا

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا — گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا
حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی — وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی — چپکے چپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا
طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا — وار اُن کا اسلیئے اکثر خطا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی — اُسکو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
ہو نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں — اُنسے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھا نہ استحقاقِ تحسیں پر سُنی تحسیں سدا — حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جسقدر بڑھتی گئی آفاق میں — کبرِ نفس اُتنا ہی یہاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر

نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

کہیں الہام منوانا پڑے گا ۱ کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نہ صوفی صفا کو تجھ میں لیکن ۲ کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہی گر نہ ہو درد یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا انھیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہو گا جنھیں مُونہ انھیں خاصوں پہ مونہ آنا پڑے گا

رہی وصفِ جناں کی مشق واعظ تمھیں بچّوں کو پھسلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی انھیں باتوں کو دُہرانا پڑے گا

تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ ۱ قطعہ یہ عقدہ ہمکو سُلجھانا پڑے گا

بہت یہاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہمنے ۲ بس اب دُنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

نہیں بو اُنس کی اس غمکدے میں ۳ کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہی ۴ ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند ۵ وفا سے ہمکو پچتانا پڑے گا

جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید ۶ ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہی جبتک

اُسے دُنیا کا غم کھانا پڑے گا

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا | یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی | تمہیں جل کے تر خاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی | بس اب دل سے شکوؤں کو دھونا پڑیگا
بن آئے گی ہرگز نہ یہاں کچھ کئے بن | جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا | مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائیگا
پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں | جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا
دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام | آج اگر آیا نہیں کل آئے گا
ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد | اک یہ لپکا دیکھیے کب جائے گا
واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے ۱ قطعہ | پر مزا آنے کا یہاں کیا پائے گا
آئے گا اور ہمکو شرمائیگا مفت ۲ | اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم ۳ | ہم پہ مونہ آئے گا مونہ کی کھائے گا
دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف | رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا
باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل | جی قفس میں اسکا کیا گھبرائے گا
رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا ۱ قطعہ | شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا
ابر و برق آئے ہیں دونو ساتھ ساتھ ۲ | دیکھیے برسے گا یا برسائے گا

ؔ ۵ مینہ۔ منہ تعطایہ کرنا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن — اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

ق

اغماض پہ چلتے وقت مروّت سے دور تھا — رو رو کے ہمکو اور رُلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یہاں — ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

ڈر تھا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز — چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ — ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

دُردی کشانِ بزمِ مُغاں کا نہ پوچھ حال — ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں — وہ دل کہ خاصِ محرمِ بزمِ حضور تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا — کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو آپنے نہ لی تم نے کچھ خبر — پھر نمازِ نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا

ق

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائیگا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا

تمکو ہزار شرم سہی مجکو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست — زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا

دیکھی ہیں ایسی اُن کی بہت مہربانیاں — اب ہم سے مُنہ میں موت کے جایا نہ جائیگا

مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی۔ مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھینگے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کُھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالیؔ پڑیں بس آپ
قصّہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

(ق)

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمھارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑیگا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اُس کا گلا ہو گیا

وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا رُکتے رُکتے دمِ آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اُسکی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری اُمید مجکو جواب
رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

ق
خلوت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا — تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا
تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کماں داری — ہم بچکے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھکو خبر ہوتی — میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا
یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سُنا قاصد — اَن پڑھ تو ہے تو یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا
باتوں میں شکایت کی بو آتی ہی الفت کی — گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا
ہم روزِ وداع اُس سے ہنس ہنس کے ہُوئے رخصت — رونا تھا بہت ہمکو روتے بھی تو کیا ہوتا
گر صاحبِ دل ہوتے سُن کر مری بیتابی — تمکو بھی قلق ہوتا اور مجھسے سوا ہوتا
جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھکو خبر ناصح — کچھ ہمسے سُنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا
جو جان سے درگذرے وہ چاہی سو کر گذرے — گر آج نہ تم آتے کیا جانیئے کیا ہوتا

کل حالیِ دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سُننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سُنا ہوتا

ق
پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا — تھا حُسن میزبان کوئی میہماں نہ تھا
ہمکو بہار میں بھی سرِ گلستاں نہ تھا — یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا
ملتے ہی اُنکے بھُول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
کیا جانتے تھے جائیگا جی ایک نگاہ میں — تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا
سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہی — تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
کچھ میری بیخودی سے تمہارا زیاں نہیں — تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات انکو بات بات پہ سو سو دیئے جواب
مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یہاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اُسکے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

(ق)

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رُسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم
شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اُس سے نادان ہی بن کر ملیے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

درمیاں پائے نظر ہے جبتک
ہمکو دعوےٰ نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اُسکو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل
مجکو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں؟
گل و بلبل کی شناسائی کا

مدد اے جذبۂ توفیق کہ یہاں
ہو چکا کام توانائی کا

مشکلوں کی جسکو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

وھاں اگر جائیں تو لیکر جائیں کیا
سو نہ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں ہے باقی وہی حرصِ گناہ
پھر کئے سے اپنے ہم پچتائیں کیا

آؤ لیں اُسکو ہمیں جا کر منا
اُس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہو اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعوےٰ کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزلخوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل - ناصح!
اُس کو کیوں بھولتے گر اِس کو بھلایا جاتا

چھپ چھپاتے اُسے دے آتے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اُس وقت سے سر پر تِرے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دُنیا
ہمسے اَب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لیکے ہٹایا جاتا

رحمت کا جہاں میں یونہیں اک نام ہی گویا
رحمت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یہاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دُنیا میں نکو نام ہے گویا

ناچیز ہیں وہ کام۔ نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں۔ اُن کا یہی انعام ہے گویا

ہے وقتِ رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی یہاں شام ہے گویا

اُٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بُری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

جب دیکھیئے حالی کو پڑا پایئے بیکار
کرنا اُسے باقی یہی اک کام ہے گویا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

ق
سنگِ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا ۔ اب دیکھنا ہے زورِ دلِ بے قرار کا
اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب ۔ وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
او مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل ۔ کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو ۔ ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا
سمجھو مجھے اگر تمہیں ہے آدمی کی قدر ۔ میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال ۔ سن لینگے وہ مآل شبِ انتظار کا
اب محو بوئے گل یہ ہوا کب دلِ حزیں ۔ ہمکو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گردِ ناقۂ لیلےٰ بلند ہے ۔ پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا
غربت کے شغلوں نے وطن کو بھلا دیا ۔ خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

حالی بس اب یقیں ہی کہ دلی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

ب

درد دل کو دوا سے کیا مطلب ۔ کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذکرِ جمیل ۔ خضر و آب بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر ۔ ظلِّ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کرینگے بھرینگے خود - واعظ تم کو میری خطا سے کیا مطلب

جنکے معبود حور و غلماں ہیں انکو زاہد خدا سے کیا مطلب

کام ہے مردمی سے انساں کی زہد یا اتقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامن آلودہ ہمکو چون و چرا سے کیا مطلب

صوفیٔ شہر با صفا ہے اگر ہو - ہماری بلا سے کیا مطلب

نکہتِ مے پہ غش ہیں جو حالی
انکو زہد و صفا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی مونہ میں زباں ہے اب (ق)

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا چہرے پہ اپنے شورشِ نہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قیدِ ہستیٔ دنیا سے ننگ تھا وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا کہتے ہیں لوگ جان کا اسمیں زیاں ہے اب

لغزش نہو - بلا ہے حسینوں کا التفات اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مُغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ہے دل غمِ جہاں سے سبکدوش ان دنوں سر پڑتا سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث
دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث

جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی
رات بھر یاروں کو چھکوایا عبث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

کوئی پنچھی آکے اب پھنستا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

کھیتیاں جلکر ہوئیں یاروں کی خاک
ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

قوم کا حالیؔ پنپنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رُلوایا عبث

ج

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
بول کر ہم نے مونہ کی کھائی آج

چُپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزم ساقی نے دی اُلٹ ساری
خوب بھر بھر کے خُم لنڈھائی آج

معصیت پر ہے دیر سے یا رب ۱ قطعہ
نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفس دوں یا شرع ۲
دیکھنی ہے تری خدائی آج

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زُہد سے الفت کی بچ کے چلنا تھا
مُفت حالی نے چوٹ کھائی آج

تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج	یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج
رنج و شادی یہاں کے ہیں سب بے ثبات	اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج
تھا قناعت میں نہاں گنجِ فراغ	پر ہمیں بیوقت ہاتھ آیا یہ گنج
فکر و فن بڑھتے تھے شاید ساتھ ساتھ	ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج
ہمکو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا	جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج
آگئی مرگِ طبیعی ہمکو یاد	شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج
راہ اب سیدھی ہے حالی سوئے دوست	ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

چ

بزمِ مے اچھی ہے۔ گو دُنیا ہے اے میخوارہ ہیچ
یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دُنیا کو دم بھر یار ہیچ

نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن بر سرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ

شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دُکاں اور رونقِ بازار ہیچ

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی ہے بہت آج بھنور کی صورت

اُنکو حالی بھی بُلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

ق

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھکر دل ہو عاشق کا بے کل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ وعدہ ہی بارِ عام اُنکے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہمکو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہی اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جسکو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھکر کرو قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ٹ

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ
دل کو یہ کیسی لگادی تو نے چاٹ

رچ رہی ہے کان میں یہاں لَے وہی
اور مُغنّی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہگئی
راج کسرےٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یہاں جی کچھ اے زاہد اُچاٹ

جو کہے تجھکو بنا دیں اے امیر — ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر — سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ
برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر — ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ
تیغ میں بُرّش یہ اے حالی نہیں — جسقدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ
چُٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

ث

باپ کا ہے جبھی پسر وارث — ہو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث
گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا — تیرا ہے کون اے ہنر وارث
فاتحہ ہو کہاں سے میت کی — لیگئے ڈھو کے سیم و زر وارث
ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ — کریں میراث سے حذر وارث
خاک و کرمانِ گور و خویش و تبار — ایک میت اور اسقدر وارث
واعظو دین کا خدا حافظ — ابنِ میل کے ہو تم اگر وارث
قوم بے پر ہے دین بے کس ہے — گئے اسلام کے کدھر وارث
ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف — جیسے مردہ کے مال پر وارث
ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

پ

یہ ہیں واعظ - سب پہ مُونہ آتے ہیں آپ
ناصحِ قوم اسپہ کہلاتے ہیں آپ

بس بہت طعن و مُلامت کر چکے
کیوں زباں رندوں کی کُھلواتے ہیں آپ

ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
چڑھکے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ

واعظو ہے اُن کو شرمانا گناہ
جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں ایک اک کی تکفیر آپ کیوں؟
اسپہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کو حالیؔ خلد سے
بستر اکیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت
پر جوانی ہمکو یاد آئی بہت

زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہٹ پہ اُسکی اَور پس جاتے ہیں دل
راس ہی کچھ اُس کو خود رائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں بچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اُسکی رعنائی بہت

چُور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حرُ
رحت اِس تکلیف میں پائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یہاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری | ہیں فدائی کم تماشائی بہت
ہمنے ہر ادنے کو اعلےٰ کر دیا | خاکساری اپنی کام آئی بہت
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے | تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی؟ | یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت؟

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اُسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت | نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل | کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل | ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار | اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے | صورت۔ اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تمنے | یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص | اُسنے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت
میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر | آڑے آئی مرے۔ تسلیم سپر کی صورت
شوق میں اُسکے مزا۔ درد میں اُسکے لذت | ناصحو اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور | رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت
رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا | راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

شاہدِ معنی کو آرایش کی کچھ حاجت نہیں
سبحۂ و سجادہ ہیچ اور جبّہ و دستار ہیچ

ہو گر بجتے جسقدر اُتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو ہے یہ سب گفتارِ بے کردار ہیچ

روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پسیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب اے چشم گوہر بار ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عاملِ مُردار خوار
کر دیئے آفاق کے سب خوان و خواں سالار ہیچ

ہے ادب مسند پہ۔ جو کچھ ہے رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ح

کاٹئے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دُنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

سنے سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

اُنکے غُصّے میں ہے دلسوزی۔ ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے اُنکو۔ گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار

دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجے کیا حالی۔ نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

مےِ مُغاں کا ہے چسکا اگر بُرا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ

ریا کو صدق سے ہی جامِ مے بدل دیتا
تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ؟

وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہمنے بارہا اے شیخ

غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھے پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

زباں پہ ہوتی ہے مُہر اُنکی جو ہیں محرمِ راز
پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادّعا اے شیخ

قطعہ ۱ خبر بھی ہے تمھیں ہے کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ہیں آپ جو لئے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

۲ وہ ڈوبتوں سے الگ ہٹتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے۔ مرحبا اے شیخ

اگو زن و گو رہیں بچپن سے تارکِ دنیا
نہایت آپ کی ہے۔ اُنکی ابتدا اے شیخ

کمالِ حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالی
پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

د

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہی اور ذوق گنہ یھاں سزا کے بعد

گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اِس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اُسکی یاد
آ گے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اِس صدا کے بعد

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد

درگذر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد

ہم دکھا دینگے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

قربِ حق کے لیئے کچھ سوزِ نہاں بھی ہی ضرو
خشک نفلوں میں دھرا کیا ہی بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تجسے
تو ہی کہہ ہمیں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جبتک ہی یہ پھیلا ہوا دینداری کا
فکرِ دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیئے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اسکے سوا اے زاہد

ذ

پیاس تیری بوی ساغر سے لذیذ
بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ

جسکا تو قاتل ہو پھر اُسکے لیئے
کونسی نعمت ہی خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب ہمکو ہے سب شہد و شکرّ سے لذیذ

قندِ شیریں تری پہلی نگاہ دوسری قندِ مکرّر سے لذیذ

بھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ

ہے یہ تجھمیں کس کی بوباس اے صبا بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ

جو قناعت کے ہیں حالی میہماں اُنکو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ر

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر وہی اصرار ہے خطاؤں پر

رہیں ناآشنا زمانہ سے حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر

رہرو و باخبر رہو کہ گُماں رہزنی کا ہے رہنماؤں پر

ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہی کیا مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر

اُسکے کوچہ میں ہیں وہ بے پروبال اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ وقف ہی یہاں برہنہ پاؤں پر

نہیں مُنعم کو اُسکی بوند نصیب مینہ برستا ہے جو گداؤں پر

نہیں محدود بخششیں تیری زاہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجے کس مُونہ سے اِن خطاؤں پر

کرتے ہیں سو طرح سے جلوہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

دوست ایسے ہیں نہ اُسکے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیرِ نر

اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جسقدر

کرنی پڑتی ہے کسیکی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسیکا عیب سُن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہمپہ لاکھ احساں اگر

عیب کچھ گنتے نہیں اُس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بیخبر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچکر لاتے ہیں اُسکو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب اُن کا ظاھر اور اپنا ہنر

دوست اک عالم کے پرمطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہی کون
خواہشِ تحسیں ہے حضرت کو مگر

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیئے بغیر
دام اُٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیئے بغیر

گو ہو شفا سے یاس جبتک ہی دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیئے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہی کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ گو رہے گی نہ ویراں کیئے بغیر

آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
مہر وص کو رہے گا نہ عریاں کیئے بغیر

عزت سے اپنی یارونکو کچھ آپڑی ہے ضد
چھوڑینگے نیمجاں کو نہ بے جاں کیئے بغیر

مشکل بہت ہی گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیئے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ۔ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیئے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت اُنھیں نہ مسلماں کیئے بغیر

حالی کٹیگا کاٹنے ہی سے یہ بیتوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیئے بغیر

ڑ

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آجتک قصرِ امل ہے ناتمام
بندھ چکی ہی بارہا کھُل کھُل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک مُحال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہمکو بھی شکار
پر نہیں زہد کوئی ٹٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ

عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اُجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کِشت ہے سرسبز اور نیچی ہی باڑ

بات واعظ کی کوئی بگڑی گئی
ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھولکر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

ز

عہدِ وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز ‏ عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز (ق)
پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز ‏ جھونکا نسیم مصر کا آیا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں ‏ ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز
آیا نہ ہوگا اُسکو تغافل میں کچھ مزا ‏ ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا ‏ اُسنے نقاب رُخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز
یھاں دیچکی جواب امیدِ جوابِ خط ‏ وھاں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق وشوق میں ہمکو بھرا ہوا ‏ کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد ‏ بھولے ہمیں کہ تجھکو بھلایا نہیں ہنوز
سرمایۂ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل ‏ باتوں میں ہمنے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اسقدر
حالی نے جام مونھ سے لگایا نہیں ہنوز

جیتے جی موت کے تم مونھ میں نہ جانا ہرگز ‏ دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی ‏ دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی ‏ زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز
چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں ‏ کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے ‏ تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رخنے تھے ترے ہو گئے ویران ای عشق / آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدرشناس / قدر یہاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ / نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سُنا اے بلبل / ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب / دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی / کوئی دلچسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یہاں خون کے دریا ای چشم / دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چُرانا ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت ای سیاح / دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یہاں گوہرِ یکتا تہِ خاک / دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانیکے نشاں بھی اب تو / اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی اُنھیں بھولگئے / ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں / نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہمکو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ / ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا انپہ جہاں روتا ہے / اِن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی / بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں / نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یہانسے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط / نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی — ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہو گی یارو — یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سُن لو کہ پھر اِس گلشن میں — نہ سُنیگا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یہاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

رنجش و التفات و ناز و نیاز — ہمنے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اُس میں پاتا ہوں — دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
شیخ! اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اک پتے کی جو ہمنے کہدی آج — رنگ واعظ کا کر گیا پرواز
ہمکو نسبت پہ فخر ہے تیری — تو گئی بھول ہم کو خاک حجاز
آج منکر بھی ناچ اُٹھیں گے — گر مغنّی کی ہے یہی آواز
خیر ہے اے فلک کہ چار طرف [1] — قطعہ — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

[1] یہ قطعہ اسوقت لکھا گیا تھا جبکہ ٹرکی کو سلطان عبد العزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ۔ مانٹینگرو اور روس وغیرہ کے مقابلہ میں اخیر صدمہ پہنچا تھا ۱۲

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ۲ ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز

ہوتے جاتے ہیں زورمند ضعیف ۳ بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز

چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے ۴ گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

ہے نہتوں کو رہگذر میں خطر ۵ رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم ۶ بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آز

ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے ۷ گھائلوں پر ہیں ہنر تیرانداز

تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے ۸ حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس ۹ اور یاروں کے یار ہیں غماز

ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ ۱۰ ہے پر آشوب جبکہ یہ آغاز

گو ابھی تک کھلی نہیں لیکن ۱۱ غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر ۱۲ موج حائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے سے اُبھرے ۱۳ یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

کام اُسے اپنے سونپ دو حالی ۱۴ نہیں جس کا شریک اور انباز

ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے ۱۵ چارہ یھاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

س

جاذبِ رحمت ہے مقتضائے عصیاں اپنے پاس

رکھتے ہیں عاصی کمندِ صیدِ غفراں اپنے پاس

عاجزوں سے معتذر کرتے ہیں اکثر درگذر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس
ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس
بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس
خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس
دستبُرد اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمد اللہ وہ مُہرِ سلیماں اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس

چھیڑ اب نہ اے تصورِ مژگانِ یار بس — کافی ہے خارِ خارِ غمِ روزگار بس
یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے — غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس
ہر داغ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا — گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس
ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں — اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ — یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر کی نیند۔ کیوں حرام ہیں اے انتظار بس

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ش

اک ہم کو مہم بر سر ایام ہے درپیش بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش
غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہی چار طرف سے اور معرکہ گردش ایام ہے درپیش
وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز اب اُس مرضِ صعب کا انجام ہی درپیش
گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی۔ قیامت پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہی درپیش
وہ وقت گیا۔ نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا اب وقتِ خمارِ مے گلفام ہے درپیش
اُمیدِ شفا کا تو جواب آہی چکا ہے اب بات کا سننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

ص

ہر بشر سے اُسکی مختص ہیں عطائیں خاص خاص ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص
دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے۔ مگر رہزنِ دل ہیں ابھی اُس کی ادائیں خاص خاص
گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گُل یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص
زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے اُمید سب کچھ۔ پر نہ ہوں شاید حساب
وہ جو کی ہیں ہمنے اے حالی خطائیں خاص خاص

درد۔ اور درد کی ہے سب کے دوا۔ ایک ہی شخص
یہاں ہی جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لیئے لائیں وہ آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یہاں عمدہ برا ایک ہی شخص

قافلے گذریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہمکو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہی۔ مگر فیض ہی جاری شب و روز
کچھ ہی شیخ۔ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

ض

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض
چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض

دل میں ہے اے خضر گر صدقِ طلب
راہرو کو رہنموں سے کیا غرض

حاجیو ہے ہمکو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض

گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
اُنکو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض

نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا
ہمکو تفتیشِ دروں سے کیا غرض

دوست ہیں جب زخمِ دل سے بے خبر
اُنکو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض

عشق سے ہے مجتنب زاہد عبث ۔ شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض
کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب ۔ اب اُسے دنیائے دوں سے کیا غرض

آ چکے ہو حالی پئے تسلیم یہاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

دوست کا ناروا نہیں اعراض ۔ دوستوں ہی کا کام ہے اغماض
چاہیئے ایک سب کا ہو مقصود ۔ گو ہوں سب کی جدا جدا اغراض
یاد میں تیری سب کو بھول گئے ۔ کھو دیئے ایک دکھ نے سب امراض
دیکھیئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش ۔ اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض
لَا اُبَالِی بِاَنْ یُعَاتِبَنِی ۔ کُلُّ نَاسٍ وَّ اَنْتَ عَنِّی رَاضٍ
مُنعمو بذلِ خیر میں یہ دیر ۔ اپنا مطلب اور اُس پہ سو اغماض
حق میں اپنوں کے سخت مُمسک ہیں ۔ جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض
رای ہے کچھ علیل سی تیری ۔ نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض
وعظ میں گُل کترتے ہیں واعظ ۔ مُونہ میں اُن کے زباں ہے یا مقراض
ہے فقیہوں میں ادرہم میں نزاع ۔ هَلْ لَنَا فِی نِزَاعِنَا مِنْ قَاضٍ
ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد ۔ خار کش تجھ سے ہے سوا مرتاض
شیخ کی تھی یہ آخری تلقیں ۔ چاہیئے زر تو اُس سے کر اعراض
ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی ۔ یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

ط

رات گذری ہو چکا دورِ نشاط — طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر — نام تھا شاید جوانی کا نشاط
دن اب ایدل منقبض رہنے کے ہیں — ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں — فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط
زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ — جانیو واعظ اسے راہِ صراط
تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ — ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط
کوچ کی حالی کرو تیاریاں — ہے قُوے میں پیہم اب انحطاط

ظ

چھپے ہیں حریفوں میں احرارِ واعظ — بُرا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ
سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر — نہ ستار ہے تو نہ غفار واعظ
نکل آئے گی مے کشی کی بھی حلت — کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ
کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن — سُنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ
ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن — یہ جُبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ
پچھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو — یہی ہے اگر حُسنِ گفتار واعظ
مُسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے — ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

ع

اے بہارِ زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع

اے بیاضِ صبحِ پیری السلام — اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا — الوداع اے عمرِ فانی الوداع

روزگارِ ضعف و سستی الصلا — وقتِ سعی و جانفشانی الوداع

قطعہ

فرصتِ عشق و جوانی الفراق — ۱ دورِ عیش و کامرانی الوداع

تجھکو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں — ۲ اے نعیمِ جاودانی الوداع

تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں — ۳ اے خدا کی مہربانی الوداع

آلگا حالی کنارے پر جہاز — الوداع اے زندگانی الوداع

غ

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ — دیکھ اس خرام ناز پہ اتنا نہ کر دماغ

ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں — حملے سے یہاں اجل کے نہیں ایکدم فراغ

یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہی دیکھکے پھولوں کو باغ باغ

وہ چار گام نقشِ قدم بن کے رہ گئے — آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں بیئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہوں — ساقی بھرے بھرا ہے مئے لعل سے ایاغ

جنگل میں لختِ لختِ گل خودرو کو دیکھکر — تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں — باری تب انکی آئی کہ گل ہوگئے چراغ

ف

حق نہ مُلّا نے کچھ بتایا صاف
اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف

آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھُلی
مہرِ روشن نظر نہ آیا صاف

کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم
صاف تھے آپ سب کو پایا صاف

زاہدو ہم تو تھے ہی آلودہ
تمکو بھی ہمنے کچھ نہ پایا صاف

کیوں فقیہوں سے رُک گئے حالی
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ق

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لایق
نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لایق

کرے گا کیا تیرا کحل الجواہر اے کحال
نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لایق

مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ
بہت ہے زندگیِ مُستعار کے لایق

غرور و حرص ہیں زیورِ عروسِ دُنیا کے
بناؤ تھے یہی اِس نابکار کے لایق

کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز
رہا نہ باغ قدومِ بہار کے لایق

بس اب ہی فضلۂ روباہ و گرگ پر گذران
رہا نہ شیرِ ژیاں خود شکار کے لایق

گنہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے
ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لایق

گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی
تمہیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لایق

یہ ہمنے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لایق

ک

دلوں کا کھوٹ اگر کیجیے برملا ایک ایک — تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں — جہاں ہو راہزنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر — بنا ہے غوثِ زماں آجکل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں — مری نگاہ میں ہو رند و پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے اُمید ہو اُسوقت — کہ یار یار سے ہو جائیگا جدا ایک ایک

چھپا کے اُس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے — جب آپ مونہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اُسکی بندگی کا ادا — لیا ہے جسنے حق خواجگی لوا ایک ایک

امیرِ حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور — تو موج بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو — ورق جب اُسکا اڑا لیگئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ — جگر کے پار ہو اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہی نہ جوانی وہ تو ہی اب نہ وہ ہم — پہ دل پہ نقش ہو ابتک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہینگے نہ حالی یہ دلخراش جہاں — رہیگی حالیِ دلگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ — ہے زمین اُنکی اور اُنکا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلایشوں میں۔ بنا شو نہیں بے لگاؤ — رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو ۔۔۔ ہے عشیرہ اور انکا دودماں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں ۔۔۔ ہے کوئی بھیدی اور انکا رازداں سب سے الگ
جانچتے اور نکو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں ۔۔۔ رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ
اک چمن بہرِ تفرّج رکھتے ہیں زیرِ بغل ۔۔۔ روضۂ و بستان و فردوس و جناں سب سے الگ
کلبۂ احزاں ہے روشن ان کا جس مہتاب سے ۔۔۔ ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند ۔۔۔ پر ٹٹولے کوئی دل انکا تو وہاں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے ۔۔۔ دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ ۔۔۔ کرتے ہیں بھرنے کو یہاں خالی تفنگ
عہدِ ہستی پر نہ پھولیں کامراں ۔۔۔ آخر اسکی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا۔ اخلاق کیا۔ ہتھیار کیا ۔۔۔ سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
روکیے بدخو کو بدخوئی سے کیوں ۔۔۔ آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ ۔۔۔ یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
پاکبازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع ۔۔۔ جو ہیں اچھے اُن پہ سب کھلتے ہیں رنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا ۔۔۔ دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی اُمنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل ۔۔۔ دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح — اب لگا کھایا پیا سب آکے انگ

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ — ہیں ابھی کم حاصلِ افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحمِ انسانی بہت — ہو گئی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق — پھوٹ ہی کا بس کھلیگا ہم پہ رنگ

ل

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل — یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل

رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف — اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل

اک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں — ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل

کب تک آخر ٹھیر سکتا ہے وہ گھر — آگیا بنیاد میں جس کی خلل

ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار — تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ امل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی — لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھئے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع — ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں — وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر — ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

م

مدرسہ میں دہر کے رو بر قفا بیٹھے تھے ہم — اُٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ
زالِ دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

صحبتیں اہلِ ورع کی سب گئیں نظروں سے گر
بزمِ رنداں میں یونہیں اک دن جا بیٹھے تھے ہم

شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اسکو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری
آدمی تجھکو سمجھکر پاس آ بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

ہے خود دنیا ہی پتیائی نہ حالی ورنہ یہاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر نہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اُسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا اُن دوستوں پر جنمیں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپکو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم

بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا
گر کبھی توفیقِ ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد ہیں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر ۔۔۔ درد خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم
ٹھیرتے جاتے ہیں جتنے چشمِ عالم میں بھلے ۔۔۔ حال نفسِ دوں کا اُتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم
جسقدر جھک جھک کے مِلتے ہیں بزرگ و خُرد سے ۔۔۔ کبر و ناز اُتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم
گو بھلائی کر کے ہمجنسوں سے خوش ہوتا ہے جی ۔۔۔ تہ نشیں ہمیں مگر دُردِ ریا پاتے ہیں ہم
ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر ۔۔۔ داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم
راہ کے طالب ہیں پر بیراہ پڑتے ہیں قدم ۔۔۔ دیکھئے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہمنے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

ق
آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم ۔۔۔ سب کچھ کہا مگر نہ کھُلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم ۔۔۔ کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں ۔۔۔ آئے ہیں آج آپ میں یا رب کہاں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں ۔۔۔ تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق ۔۔۔ بدلینگے تجھکو زندگیِ جاوداں سے ہم
لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر ۔۔۔ آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم
ہنستے ہیں اُس کے گریۂ بے اختیار پر ۔۔۔ بھولے ہیں بات کہکے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو ۔۔۔ کچھ پا گئے ہیں آپکی طرزِ بیاں سے ہم
دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں ۔۔۔ ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ — پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

ن

یاروں کو تجھ سے حالیؔ اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اُسکی دل سے دھو دے اے چشم تر تو مانوں — اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی — الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غَیبت ہو یا حضوری دونو بُری ہیں تیری — جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جسکو جنت وہ اک جھلک ہے تیری — سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے — شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو — کچھ اِن دنوں تو ہمپر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یہاں اب تو حقیر ہیں ہم — بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہمپر ہنستے ہیں چار ہمپر — یہاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش — حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جنکے نشاں تھے برپا — کچھ مقبروں میں باقی اُنکی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے — اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہی کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

جب سے سُنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سُنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوتے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یہاں ڈھونڈھتے ہم آسایش کو
کھُل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں

چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیئے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس اُنھیں گر اپنا ذرا ہو۔ جاں اپنی بھی اُن پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسیکا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اُسکو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

یہاں تو بدولت زہد و ورع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیئے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بیوقت سی تھی

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں

بس کوئی دن کا اب **حالی** یہاں سمجھو تم مہمان ہمیں

کی تو ہیں ہمنے بھی **حالی** کوچ کی تیاریاں — سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خواب رحت میں وہ لذت تیرے ای پیری نہیں — جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار — ناگوار اُنسے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی — سب کو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال — اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں ہشیاریاں

بے مزہ ہی اہلِ دیں کی ترشروئی بھی مگر — اُس سے پھیکی اہلِ دنیا کی ہیں ظاہرداریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادّے فاسد نکل

کم ہوئیں **حالی** نہ لیکن نفس کی بیماریاں

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں — آج ہم شہر میں خون اپنا ھدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہمنے کہی ہے شاید — جتنی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

جُرم خالق سے سوا پاتے ہیں جرمِ فقہا — جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ! — بول قوّال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زاھد — یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب. ہنر دکھلاؤ — ورنہ یہاں عیب تو سب فردِ بشر کرتے ہیں

غمزدو رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ دل دکھاتے ہیں وہی جن میں کہ گھر کرتے ہیں
جی رکاوٹ سے جو اُن کی کبھی رُک جاتا ہے اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں
ایک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں
تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں
قیصر و زار کا یہاں پیٹ تو بھرنا معلوم بس ہماری ہی طرح وہ بھی گذر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں رخنے نکلینگے سیکڑوں اسمیں
کی نصیحت بُری طرح ناصح اور اک بس ملا دیا رس میں
ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے چشم انسان و چشمِ نرگس میں
بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز اب دھرا کیا ہے اُسمیں اور اِسمیں
ہو قبضے میں جب عنانِ فرس ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں
جس سے نفرت ہی اہل نعمت کو وہی نعمت ہی چشمِ مفلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور۔ آدمی۔ فرشتہ۔ خدا آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
آج کل چرخ صلح جو ہی بہت دیکھیے ہو بگاڑ کس کس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اُسکو مجلس میں

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں　　ہیں مئے ناب کے دلّال - قدح خوار نہیں
شہر میں اُنکے نہیں جنسِ وفا کی بکری　　بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں
کونسے وہ گلِ رعنا پہ نوا سنج نہیں　　کونسی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں
کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا　　اور جو پھر دیکھو تو دونوں سے سروکار نہیں
اُٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی اُنسے　　دل پھنساکر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ　　اور جو ہو کیسل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا اُن کو　　دربدر جھانکتے پھرنے سے اُنھیں عار نہیں
بوالہوس کام طلب بندۂ نفس اہل ہوئے　　ایک عالم ہے اِسی رنگ میں دوچار نہیں
دعویٔ عشق و محبت پہ نہ جانا اُنکے　　اُن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہدو واللہ کہ صادق نہیں - زنہار نہیں

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آکے پھر چمن میں　　اِک حشر سا ہے برپا مُرغانِ نغمہ زن میں
بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے　　بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں
بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا　　پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں
چُپ ہے زبان سوسن حیراں ہی چشم نرگس　　قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

میں اور تو ادائیں ساری سہی قدوں کی　　پڑتی ہے جان باقی بس سرو و نارون میں

ہے عید اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں　　جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں

سو منہ سے دھواں سا اُٹھا لیتے ہی نام اسلام　　بارود بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا۔ حالیؔ نہ چھیڑنا تھا　　فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دُکھڑا سو بار قوم کا ہم　　پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی　　تم نے سُنا بھی؟ اُس پر کیا گذری انجمن میں

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا　　روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

روبہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملت　　تھی سہمناک کل تک جو شیر کے بدن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمنؔ کی　　ہے اب بجائے حکمت خاک اُڑ رہی یمن میں

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدنؔ کے　　ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عدن میں

قبرِ اُویس پر ہے بس فخر اب قرنؔ کو　　زندہ اُویس کوئی باقی نہیں قرن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اُڑا دی　　فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہوگی آگے اے دورِ چرخ شاید　　جو اب کے تو نے ہلچل ڈالی ہے انجمن میں

فوج اور بھیڑ دونو پھرتی ہیں بے سری سی　　گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رن میں

خُرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس۔ گویا　　لُٹنے کی قافلہ کے پہنچی خبر وطن میں

8 یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ الایمان یمانٍ والحکمة یمانیة۔ یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے۔ اسی بنا پر میر باقر داماد نے اپنے فلسفہ کا نام حکمتِ یمانیہ رکھا ہے ۱۲

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب — جائیں کدھر کہ ہر سو دَوں لگ رہی ہے بن میں
حالی بس اب نہیں یہاں سُننے کی تاب باقی — مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

(ق) ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جاکر نظر کہاں
ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور — ہوتی ہے آج دیکھیے ہمکو سحر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اُسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں کسل و رنج راہ کا — خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر — اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

(ق) پیا ہے ہم نے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں — خزاں کو لیگئے ہمراہ اگر پُہنچے گلستاں میں
نہیں کچھ منحصر وابستگی زلفِ پریشاں میں — جو دل چاہے تو اُلجھے اک غبارِ دودِ پیچاں میں
اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشقِ زلیخا نے — نہ رہنے دیگا حُسنِ خود نما یوسف کو کنعاں میں

تصور نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو — نہ کچھ کلفت ہی زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر — کہاں تک جی نہ گھبرائے اکیلے دردِ ہجراں میں

زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز — نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کامِ دل اے خضر — سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آبِ حیواں میں

نہ چھوڑیگی محبت یار سے ناکام عاشق کو — نسیم مصر کو پھر آنا ہے اک دن بیت احزاں میں

گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے — ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

بہت دن چاہئیں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک — نکلکر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں (ق)

مجھکو تم سے پر اعتماد وفا — تمکو مجھ سے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ — زندگی موت ہے حیات نہیں

یوں نہیں گذرے تو سہل ہے لیکن — فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید — جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسیکی ذات نہیں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں — چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں (ق)

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال — اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہنسنے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار — بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا — فتنۂ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب! صدق و صفا یہاں ہی انھیں کے دم تک — مصلحت برہمیِ صحبتِ رنداں میں نہیں

یہاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد — جسکو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھیر جائے گا — بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کس طرح اُسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں — خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ — ایسے اُلجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جائے — اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اُس مردِ مسلماں میں نہیں

غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں — شادیِ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں (ق)

خوبروئی کے لئے زشتیِ خو بھی ہے ضرور — سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھسا طرحدار نہیں

قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار — ہمکو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا — دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اُس کی وفاداری کا
جسکے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں

دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کونسی راہ
کعبہ و دیر سے کچھ ہمکو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلع ثانی سُنکر
جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

ق
میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

چشم بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ
غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں

ہو چکا ناز اُٹھانے میں ہے گو کام تمام
للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں

مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا
دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں

اصلِ مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں
لائی ہے بوئے اُنس نسیمِ چمن کہاں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

اہلِ طریق جسکو سمجھتے ہیں زادِ راہ
وھاں وخل دست بُرد کو اے راہزن کہاں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں
مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا
لیجائے ہمکو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا اب ہم کہاں ہولئے نشاطِ وطن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالی نے وھاں مگر
جاتا ہے محو شوق کا دیوانہ پن کہاں

(ق)
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آپہنچا وفا کا گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پر درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھکو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے ملکر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

و

(ق)
مرے دل میں ہو۔ گو مجھ سے نہاں ہو مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو
نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو
تقاضائے محبت ہے۔ وگرنہ مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بیقدر رہوں محفل میں تیری — کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو
مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں — بہت کیوں آج مجھپر مہرباں ہو
کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے — جسے سُننی ہماری داستاں ہو

مؤثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اُس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

حکم ہے پیرِ مُغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ — خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ
دل کو کس طرح سمجھیئے کہ وہی ہے یہ دل — وہ امیدیں ہیں نہ ارماں وہ اُمنگیں ہیں نہ چاؤ
یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر — تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ
دوست ہوں جسکے ہزاروں وہ کسیکا نہیں دوست — سچ بتا تجھکو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ
تو وہی برقِ جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن — ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ
ایک ہی دوست اور اُس سے ہمیں چھُڑواتے ہو — ناصحو اب تمہیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ
ہو گیا ذکر قیامت تو اب اے حضرتِ واعظ — باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ
تجھکو اے ابر بلا دیکھکے جی چھوٹ گیا — ایکہی بار تم اے بادلو اسطرح نہ چھاؤ
پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا — ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
دیکھیں کسطرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ اُمید — آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی ملکے بہاؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک — آج کل کیجئے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ — وقت اب ہاتھ سے جاتا ہی جو آتے ہو تو آؤ

اُسکے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

ھ

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہو اب بھی سب کچھ

ہر اک کو نہیں ملتی یہاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں۔ دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میرو مرزا
نہیں پوچھتے یہاں حسب اور نسب کچھ

یہ طبلِ تہی ہیں جو بُنکارتے ہیں
جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

دیا تونے یہاں جس بہانے سے چاہا
ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خست سے واعظ
وہ گرمائیگا یہ پسیجینگے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میر مجلس کہ جینے کی موت
ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمہ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اسمیں دولت زیادہ

مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ثابت ہو خسّت زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ

ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اسمیں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یہاں ہم زمانہ کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی

الاہیں نہ بس آپ شہرت زیادہ

(ق)

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سُن
مری الفت در و دیوار سے پوچھ

ہماری آہِ بے تاثیر کا حال
کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ

دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری
کمندِ گیسوئے خمدار سے پوچھ

دلِ مہجور سے سن لذتِ وصل
نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ

نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق
ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ

نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست
کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ

فریبِ وعدۂ دلدار کی قدر
شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ

فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل
یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ

تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم
وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ی

ہے انکی دوستی پر ہمکو تو بدگمانی
وہ ہمکو دوست سمجھیں یہ انکی مہربانی

بے جرم کوئی آخر کب تک سنے ملامت
ناصح سے ہمکو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کے دلکو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے
دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی

امیدِ وصل سے ہے کچھ جی ٹھہرائے دیتا
جو کچھ سنا ہی ہمنے مشاطہ کی زبانی

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں ہیں خوش
کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی

صبر و سکوں سے ہمکو یہ بھی نہ پڑنے دے
تھوڑی سی رہ گئی ہی اے کاہشِ نہانی

پھر یہ بناے ہستی ہو تیرے بعد ویراں ہو تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے کیا جانے کس ادا سے کی اُس نے دلستانی

اک نکتہ کے بیاں سے عہدہ بر نہو گئے حالی
چلتا نہیں کسیکا یہاں لافِ نکتہ رانی

کہدو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے

جو کچھ ہے سو ہے اُسکے تغافل کی شکایت قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے

دلّالہ نے امید دلائی تو ہے لیکن دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلاسے

ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہِ خوباں یہاں ہیں۔ تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے

پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے

درگذرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے درگذریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

جب وقت پڑے دیجیے دستک درِ دل پر
جھکیے فقرا سے نہ جھجکیے اُمرا سے

بُلبل و قمری میں ہو جھگڑا کہ چمن کسکا ہے کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کسکا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار مرو کسکا ہے بدخشان و ختن کسکا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کسکا ہے

مطمئن اِس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخِ کُہن کسکا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہی یا ذات خدا
ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کسکا ہے

آج کچھ اَور دِنوں سے ہے سوا استغراق
عزمِ تسخیر پھرا شیخِ زمن کسکا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں رُوپ اے گُل و نسرین و سمن کسکا ہے

عشق اُدھر عقل اِدھر دھن میں چلے ہیں تم ہی
رستہ اب دیکھیے دونو میں کٹھن کسکا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اُس کی
ولولہ تجھمیں یہ اے مُرغِ چمن کسکا ہے

ہیں فصاحت میں مَثَل واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ اَور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و میرِ سپہ باغ باغ ہیں لیکن
بہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب
کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق اُنھیں نہیں گر دوستوں سے چھُٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیئے خلجان بینوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز
زمیں بھی اپنے خزانے اُگلتی جاتی ہے

اُڑے گی خاک تقدس کی اب سرِ بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اُچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بُری اور بھلی سب گذر جائیگی ۔ یہ کشتی یونہیں پار اُتر جائے گی
ملیگا نہ گلچیں کو گُل کا پتا ۔ ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملّاح یہ دن سدا ۔ کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر ۔ یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ ۔ یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں ۔ یونہیں عمر ساری گذر جائے گی

سُنینگے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی ۔ کہ اُنکے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن ۔ حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں ۔ یہ گلچینی ہی یا لُٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی
کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے ۔ یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب اگر پہلوانی پر ۔ گئے جیتان سب چینی و فرغانی و قبچاقی
ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ ۔ لُنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو گر ساقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی ۔ بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز
اسمیں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک کُھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی
اسمیں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے
گھات میں اُن کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہو دوست ہے تو بھی لیکن
بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اے غمِ دوست تجھی پر نہیں اپنی گذراں
کچھ فتوح اسکے سوا اور ہے بالائی بھی

دل غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ
تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی؟

عقل ہے۔ اپنی حماقت کے چھپانے کی اُنھیں
جنمیں کچھ ساتھ حماقت کے ہی خودرائی بھی

عقل اور حسن پہ جچنے بھری مجلس ہو گواہ
اُنکو خودرائی بھی پھبتی ہی خود آرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تمسے ہمیں جی بھر کر
فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم۔ پہ رہے مُردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہمنے طبیبوں کی مسیحائی بھی

رہا کھلکے زاہد کا زہدِ ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

بُرائی ہی رندوں میں بھی شیخ! لیکن
کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی

گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب
عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی

رُکا ہاتھ جب۔ بنگئے پارسا تم
نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے
سوا اسکے مُنعم میں ہی کیا بڑائی

8 یعنی غم دنیا و غم زن و فرزند وغیرہ ۱۲ ✠ اپنے دائم المرض ہونے کی طرف اشارہ ہے ۱۲

جو کہیے تو جھوٹی جو سُنیے تو سچی ۔۔۔ خوشامد بھی ہمنے عجب چیز پائی

ہوئی آکے پیری میں قدرِ جوانی ۔۔۔ سمجھ ہمکو آئی پہ ناوقت آئی

وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت ۔۔۔ وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی

جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح ۔۔۔ جو وھاں دل پہ لی تھی تو یھاں مونہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی

نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

وصل کا اُسکے دلِ زار تمنائی ہے ۔۔۔ نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

قطعِ اُمید نے دل کر دیئے یکسو۔ صد شکر ۔۔۔ شکل مُدّت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے

قوّتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں ۔۔۔ وقت جب آکے پڑا ہے یہی کام آئی ہے

ڈر نہیں غیر کا۔ جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے ۔۔۔ ہمنے جب کھائی ہے اپنے ہی سے کھائی ہے

نشہ میں چُور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں ۔۔۔ پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے

نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی ۔۔۔ بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی۔ اور انگلیاں اُٹھیں سب کی

سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

اُتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے ۔۔۔ جسقدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دو چار ۔۔۔ آئے اِس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے

دیکھ اے بُلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھولکر ۔۔۔ پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی　　لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے

چیونٹوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق　　آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے

تجھ میں جو ت ملے شمع ہے کس برقِ عالم سوز کی　　جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

تم میں وہ سوز نہ ہم میں ہے وہ ایماں باقی　　رہ گیا کھیل ہے اب اے گبر و مسلماں باقی

بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اُسوقت　　میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی

حق ادا اک نگہِ لطف کا ہوگا کیونکر　　دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی

ظاہرا دردِ ہی الفت کا نہیں چارہ پذیر　　ورنہ چھوڑا انہیں ہمنے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجئے　　نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجئے

وھاں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار　　اُس سے آخر کسطرح پیدا تعارُف کیجئے

ضبط کیجے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں　　اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجئے

دوست کے تیور میں ہم ہر رنگ میں پہچانتے　　بے تکلف ملئے ہمسے یا تکلُّف کیجئے

جب کہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول　　شیخ لگتے ہاتھ اسپر بھی تصرُّف کیجئے

وقت تھا جو کام کا حالی گنوا بیٹھے اُسے　　جانئے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجئے

تو یہ حضرت کی یونہیں اک دودہ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دینگے ذرا دم بھر توقّف کیجیے

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی | جان کو ہمنے لگا لی ہے یہ علّت کیسی
جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیمِ خزاں | جنکی قسمت میں ہو کلفت اُنھیں راحت کیسی
جی کا اُلفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا | وہ تو آفت تھی ہمارے لیئے۔ الفت کیسی
جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع نادل | قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی
عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ | جنکو کچھ کام نہیں یہاں۔ اُنھیں فرصت کیسی
جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا | وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی
جانتا ہے وہی۔ دل پر ہے گذرتی جسکے | ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی
ہمنے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک | ہمسے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی
جبکہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح | وجی بھی کام نہیں کرتی۔ نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے **حالی** انجام
اُسکی ہیں بھی تو کہوں ہے یہ عنایت کیسی

سعی سے بہتر تن آسانی مری | کفر سے بدتر مسلمانی مری
تھا نہ محتاجِ سبب عفوِ کریم | کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری
خلد میں بھی گر رہی یاد اُسکی زلف | کم نہ ہو شاید پریشانی مری
ہے لباسِ جسم تک مجھپر گراں | دور جا پہنچی ہے عُریانی مری

مانعِ گلگشت ہے بیمِ خزاں — موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدرِ نعمت ہی بقدرِ انتظار — حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

خندہ زن ہے اُس مسلمانی پہ کفر
جیسی ہے حالیؔ مسلمانی مری

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سُنا کیے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے — ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید — اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی — اُتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے
دَیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے — نرخِ متاعِ عشق۔ الٰہی گراں رہے

حالیؔ سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اُن میں کہاں رہے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اُس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
یا کھینچ لائے دَیر سے رندوں کو اہلِ وعظ — یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مُغاں رہے
وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس — ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیمجاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا روسیاہ — تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسیکی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

(ق)
حق وفا کے جو ہم جتانے لگے　　آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
تھا یہاں دل میں طعن وصل عدو　　عذر اُن کی زباں پہ آنے لگے
ہمکو جینا پڑے گا فرقت میں　　وہ اگر ہمت آزمانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کُھل جائے　　اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی　　غیر الفت بہت جتانے لگے
تمکو کرنا پڑے گا عُذرِ جفا　　ہم اگر دردِ دل سنانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم　　ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے
جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مُغاں　　قافلے پھر حرم کو جانے لگے
سرِّ باطن کو فاش کر یارب　　اہل ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

(ق)
حشر تک یہاں دل شکیبا چاہیئے　　کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیئے
ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار　　اُسکو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیئے

غیر ممکن ہے نہو تاثیرِ غم حالِ دل پھر اُسکو لکھا چاہیئے
ہے دل افگاروں کی دلداری ضرور گر نہیں اُلفت مُدارا چاہیئے
ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیئے
دوستوں کی بھی نہو پروا جسے بے نیازی اُسکی دیکھا چاہیئے
بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز کیجیئے اغماض جتنا چاہیئے
شیخ! ہے اِن کی نگہ جادو بھری صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیئے

لگ گئی چپ حالیِ رنجور کو
حال اُس کا کس سے پوچھا چاہیئے

(ق)
جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے
خط آنے لگے شکوہ آمیز اُنکے ملاپ اُنسے گویا ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہمکو وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے
مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ اِن دنوں ذوقِ عصیاں درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے
قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے
وفا شرطِ اُلفت ہے لیکن کہاں تک؟ دل اپنا بھی تجھسا ہوا چاہتا ہے

بہت حظ اُٹھاتا ہے دل تجھ سے مِلکر قلق دیکھیے کیا ہوا چاہتا ہے
غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گذرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

(ق)
جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے آج دل لے گا اگر کل نہ لیا۔ یاد رہے
شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اُس شوخ سے ہم یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے
ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر نہ وہ برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت۔ لطف سمجھ کر کیجیے اس بھلائی کا ہے انجام بُرا۔ یاد رہے
شیخ یہاں شرمِ گنہ شوق بھلا دیتا ہے توبہ اُنکی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے
وادیٔ عشق میں موسیٰؑ کو ہو گر رخصتِ دید ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے
خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا بھول جائینگے رہِ آبِ بقا یاد رہے
دل بری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے
چارہ گر کار باندازۂ تدبیر نہیں کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائینگے مزا۔ یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
افسوں شبِ وصال کے یہاں کارگر نہیں نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمایشِ تقدیر کا ہے وقت | وہ امتحانِ برّشِ شمشیر کر چکے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے | ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز | دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے

جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار | مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ | گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالیؔ اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

(ن)

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے | محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُن کی | وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات | مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی | جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے

بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار | تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد | نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت | مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں آ کر سو جانے | یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے

8 یہ غزل تقریباً ۱۲۹۱ھ ہجری میں اُس وقت لکھی تھی جب کہ اول ہی اول بتقریبِ ملازمت دلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا۔ اُس وقت اول تو دلی سے جدا ہونا ہی سخت شاق گذرا تھا۔ دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ سو وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی۔ اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور و شور رہا۔ آخرکار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا۔ اُس تنہائی اور بے سروسامانی و غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے ۱۲

نہیں آتی کہیں یہاں بوئے یوسف مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اسقدر عام کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلی نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامہ بزم خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس باغ کا پھول؟ جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس مصر کی بو؟ جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے
نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام یہی گر جذبہ مہرِ وطن ہے
گریں نظروں سے سب باتیں پرانی مگر الفت کہ اک رسم کہن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی!! یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اُسنے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہمکو ابھی اِسمیں سخن ہے

ق
دُھوم تھی اپنی پارسائی کی کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ہمکو طاقت نہیں جدائی کی
مُنہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے تمکو عادت ہے خود نمائی کی

یہ غزل بھی لاہور میں اُسیوقت لکھی گئی تھی جبکہ غزل سابق لکھی گئی تھی۔ آخر کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے ۱۲

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں — صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن — ہم سے باتیں کرو صفائی کی

دل رہا پائے بندِ الفت دام — تھی عبث آرزو رہائی کی

دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے — رکھیئے امید دلربائی کی

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے — بو نہیں آتی آشنائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی

بختِ ہما۔ آستانِ شیدا[8] — تو نے آخر کو نارسائی کی

صحبتِ گاہ گاہیِ رشکی[+] — تو نے بھی ہم سے بیوفائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے — ساعت آپہنچی اُس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

(ق) کردیا خوگرِ جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی — پر خدا جانے کیا کیا تو نے

کیوں نہ آئیں گے یہاں وہ اے ہمدم — بس سنا میں نے اور کہا تو نے

گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج — نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے

صبر کا ہے بہت برا انجام — ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

8 شیدا سے مراد منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اُس زمانہ میں کبھی کبھی فکرِ شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے ۱۲

+ رشکی آنریبل نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد کا تخلص ہے ۱۲

ابتدا اے وفا ہے سر دینا　　میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل　　اور کھویا رہا سہا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک　　ہمکو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج

حالی اپنا کہا سنا تو نے

ق

کر کے بیمار دی دوا تو نے　　جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا　　اب لیا چشمۂ بقا تو نے

شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا　　آکے مسجد سے کیا لیا تو نے

دور ہو اے دلِ مآل اندیش　　کھو دیا عمر کا مزا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ　　کیا کیا چشم آشنا تو نے

دل و دیں کھو کے آئے تھے سوئے دیر　　یہاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے امیدِ خلد پر حالی

کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

ق

دل کو درد آشنا کیا تو نے　　دردِ دل کو دوا کیا تو نے

طبع انساں کو دی سرشتِ وفا　　خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصلِ جاناں محال ٹھہرایا　　قتلِ عاشق روا کیا تو نے

تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں　　غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبالِ فرقت میں　　　شوق کو جاں گزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منتِ غیر　　　جاذبِ دل کو رسا کیا تو نے

قطعہ

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی ۱　　　درِ میخانہ وا کیا تو نے

قطع ہونے ہی جب لگا پیوند ۲　　　غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ　　　عشق کو رہنما کیا تو نے

ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی　　　عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہرِ پسر　　　اسکو اُس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہزنِ ہوش　　　بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد　　　درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہرو کو ذوقِ طلب　　　سعی کو نارسا کیا تو نے

پردۂ چشم تھے حجاب بہت　　　حُسن کو خود نما کیا تو نے

عشق کو تاب انتظار نہ تھی　　　غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دَیر خراب　　　جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھی احباب　　　ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب　　　کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو　　　آخر اپنا کہا کیا تو نے

٭ اس شعر میں مہرِ پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی طرف اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ ہیں ۲

رباعیات

توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو۔ جانا ہے ضرور بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ایضاً

طوفاں میں ہو جب جہاز چکر کھاتا جب قافلہ وادی میں ہو سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا وہاں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھکو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

توحید

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سُکھ میں بھول جائیں اطفال
لیکن انھیں دُکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ایضاً

مٹی سے۔ ہوا سے۔ آتش و آب سے یہاں
کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر۔ تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک
گنجینۂ غیب میں اُسی طرح نہاں ⁸

ایضاً

ہستی سے ہے تیری۔ رنگ و بو سب کے لئے
طاعت میں ہے تیری۔ آبرو سب کے لئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لئے

ایضاً

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اِس سے زیاد
دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر۔ جو کہ ہیں تجھ سے لَو لگائے بیٹھے
رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

نعت

زُہاد کو تو نے محوِ تمجید کیا
عُشّاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آکے توحید کیا

ایضاً

8 یعنی جو کچھ اب تک ظاہر ہوا ہے وہ بمقابلہ اُسکے جو خزانۂ غیب میں مخفی ہے کان لم یکن ہے۔

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
اور اُمیّوں کو خیر اُمم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا

ایضاً

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری ابوّت سے شرف

صلح کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنّم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترکِ شعر عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہمکو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل اُن کے ہیں ظرف اُنکے جو کرتے ہیں ٹیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہیئے اب کیا ہے صلاح فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے۔ پہ اتنی ہے خبر اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھیرائیو بد اے فرزند ایک آدھ ادا اُنکی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں ہوں اُسمیں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بے جا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی بلا سے گر جوانو مفتوں گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے ابتم کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اَور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور پر عیب سے بچئے تا بمقدورِ ضرور

عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں اُنکے نہ بڑھجائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ۔ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع۔ دمؔ اور قدم
بڑھتا گیا جسقدر کہ حسنِ گفتار
بس اُتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں
پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مُفت یہ امکاں ہے۔ مگر
عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سر گیں

طالب کو سوچ سمجھکر پیر بنانا چاہیئے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اسکے سوا اُنمیں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجام ترقیِ بشر
یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنسکر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب
ہو جائیں گے جہل چھلکے سب عیب ہنر

ؔ دمؔ دعوٰی اور قدم عمل ۱۲

مُسرِف کو کیونکر فراغت حاصل ہوسکتی ہے

اک مُنعمِ مُسرِف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لیئے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اُٹھا کر سوے چرخ
محتاج کر اسکو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یھاں رہنے کی مُہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج۔ تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُنکو جلدی بھگتاو
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہی نفس میں انساں کے جبلی یہ مرض
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلبگار عوض
جو خاص خدا کے لیئے تھے کام کیئے
دیکھا تو نہاں اُنمیں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو کل اسکی باری
بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضاے سن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنسکے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی اُمید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا

دُنیاے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس بیٹھے بچکے جوتنے سے دہقان
یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا
شیریں سخنی سے شہد فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق
آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

مُسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکّا
ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
سُنتے ہیں کسی کو جب مُسلماں پکّا

مکر و ریا

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
خطرہ اُنھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ
ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُنپر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھیرایا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمۂ نعما و آبادی تو ہے
آسایشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

ایضاً

ہی بجھسے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھسے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کیطرح
رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اُسکو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کلمات کا نسب بھی عالی
پر اُسکو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا۔ مجھسے ہی عزت ہی جہاں
فرمایا ہنر نے۔ میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونو کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

توقع بیجا

ہیں یار رفیق۔ پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز۔ لیک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جسقدر کمی اور بیشی
اُتنی ہی مغایرت ہے بیگانہ اور خویشی
وہ دوست نہیں جسنے کیا فکرِ مآل
ضدّین ہیں دوستی و دوراندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سوا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایضاً

اے عیش و طرب تونے جہاں راج کیا
سُلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تونے نینوا اور بابل
بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اَوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

عشق

اے عشق کیا تونے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرِف اور جوانوں کو تباہ

دیکھا ہے سدا اسلامتی میں تیری　　قوموں کو ذلیل۔ خانہ انوں کو تباہ

سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم　　سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت　　یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دُنیا کو دیئے دین نے اَسرار و حِکَم　　دُنیا نے کمر دین کی تھامی جبدم
گر دین کی ممنون بہت ہے دُنیا　　دُنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ　　کافر کہا واعظ نے اُنھیں اور گمراہ
جھُوٹے کو نہیں ملتی شہادت جسوقت　　لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار　　اُس قوم کا جینا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جسکو ہرگز پروا　　ذلت سے نہیں ہے جسکو ہرگز کچھ عار

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا　　مقبول تر اکون ہے بندوں میں سوا

8 یعنی کفر و ضلالت ایسی چیزیں ہیں جن کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیخ اکبرؒ کو بعضوں نے صدیق کہا ہے اور بعضوں نے زندیق اور یہ بات کہ وہ فی الواقع صدیق تھے یا زندیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ پس جس شخص میں کوئی صریح اخلاقی برائی یا عیب موجود نہو اسکی تکفیر یا تضلیل کرنی ایسی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مدعی کو شہادت نہ ملے اور وہ اپنے دعوے پر خدا کو گواہ قرار دے ۱۲

ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجے تسکیں زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے اِس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمّت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لیکر سو بار
آخر سرِ بام لیکے پہنچا تو کہا "مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار"

کم ہمتی

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار دیکھا تو نہ تھا کچھ اسکا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذّت سے نداستوں کی جانا ہمنے دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسُف بر وفات نواب ضیاءالدین احمد خان مرحوم نیّر تخلص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار سو اُسکی بھی کل سے نہیں آتی آواز

ایضاً

غالبؔ ہے نہ شیفتہؔ نہ نیرؔ باقی — وحشتؔ ہے نہ سالکؔ ہے نہ انورؔ باقی
حالیؔ اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں جہاں ہر اک مخزن میں — محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسٰیؑ کو ملی نہ قوم کی چوپانی — جب تک نہ چرائیں بکریاں مَدیَن میں

گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اسکا اُنکی گردن پہ وبال — دے دیکے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فُقہا کا مومنوں کو بے دیں — سُنتے سُنتے یہ ہو گیا ہمکو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فُقہا نے کہ نہیں؟

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہمسے سوگواری سُن لو — کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سُن لو
افسانۂ قیس وکوہکن یاد نہیں — چاہو تو کتھا ہمسے ہماری سُن لو

تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے

8 یہ اُن شعرائے دہلی کے نام ہیں جنکے ساتھ راقم کو ربط اور اختصاص تھا ہے عام اس سے کہ وہ مشہور و نامور ہوں یا نہ ہوں ۱۲ (حالی)

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کیلئے
بنتی نہیں زندگی میں بےکام کیئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کیطرح
مُردوں کی طرح جیئے تو کیا خاک جیئے

جھوٹی نمایش

ہیں جھوٹ کے بیچ میں سب سمونے والے
بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جنکی جیبوں میں مدام
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہُنر ہوں ذات میں جسکی ہزار
بدظن نہو عیب اُسمیں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کرکے نظر
کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

سکوتِ درویش جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ
خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ مونہ سے یا نہ بولیں حضرت
معلوم ہے ہمکو جتنے پانی میں ہیں آپ

§ - یعنی جب تک کہ کشتی نہ بنائی ۱۲

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و خبر
کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں۔ ورنہ
کُتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا
ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھسا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر
اُس سے بھی گیا کہ جسکے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت ہو جب کانوں میں
دانائی کی باتوں میں اور فسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جسطرح
دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارمر کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سُنکر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور
داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سُنکر ناخوش
مقصود یہ ہے کہ ہو ستایش کچھ اور

حُسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں
نیکی میں شک اُسکی کوئی لایا ہی نہیں

ہو سکتے رائج ہیں بھی شاید کچھ کھوٹ
پر اُسکو کسی نے یہاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی بُرائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام
اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار
اور مُفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکرِ عقبیٰ

منزل ہے بعید۔ باندھ لو زادِ سفر
موّاج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ لیجلو مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگذر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں
ممکن ہے۔ بدی کا نہ رہے اُسمیں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ۔ پہ حقیقت یہ ہے
انسان ہے ابتک وُہی قرنُ الشیطاں

سلاطین کا عشق

ہر چند بُرا ہے عشق کا سب کے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سُلطاں ہو اگر ظلِ الٰہی تو عشق
ہو ظلِ الٰہی کے لیئے وقتِ زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ
پر تجھسے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لیئے تیار رہنا چاہیئے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر — انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اُٹھا چکے۔ اب حالی — مجلس کرو برخاست۔ ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا — زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جسطرح کہ سونے کی کسوٹی ہی محک — ہی جوہر انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غُصہ پہ کسی کے غُصہ آتا ہے وہیں — جب تک کہ ہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر — پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سُفہا کی مدح وذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری — کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر (نصیبِ اعدا) — رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم — پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جسکا پانا ہے مُحال — آتا ہے وہ وقت جسکا ٹلنا معلوم

اسراف

مُسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں — نعمت نہ خدا کی رایگاں یوں کھوئیں
گر بُخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں۔ بہتر ہے — اس سے کہ فضولیوں پہ ان کی روئیں

ردِ سُوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے۔ نہ صواب　　زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار اے دُوں ہمت　　سائل کے سُوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھُوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسّر آئے ہیں ہمیں　　جو دیکھکے چکھکے دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے ای بھُوک　　جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال　　مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی　　اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوں کو بُرا سُننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا　　جو کر کے بھلا۔ خلق سے سُنتے ہیں بُرا
ان گالیوں کا ہے جنکو چسکا حالی　　آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریّہ مدحِ کلام راقم

جوشِ خُمِ بادہ جامِ خالی میں ہوا　　پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیم نے دی کچھ اسطرح دادِ سخن　　مجھکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

* مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستایش میں اُسوقت بھیجے تھے۔ جب کہ مدت سے فکرِ شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُن قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی ۱۲

احسان بے منت

احساں کے ہی گر صلہ کی خواہش تمکو ۔ تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احسان نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اُسے عام ۔ اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

قانون بد اخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار ۔ حاشا کہ ہو انپہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُنکو نہیں حاجت انکی ۔ اور بد نہیں بنتے نیک اِنسے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں ۔ بھڑکے گی مدافعت سے اور آتش کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف ۔ جز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل ۔ اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اُٹھکر کہ حضور ۔ ہے ٹیکس کا وقت بھی اسیطرح اٹل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں ۔ اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے ۔ بس مجھکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

اڈیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں ۔ دل دیتے ہیں پر جی سے گذرتے نہیں یوں

تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اُس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جسکے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

نواب وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اُسکی چھوڑ دی ہمراہی
اقبال پہ جس نے فتحیابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی اُنسے
ہے جنکی رگوں میں خون آصف جاہی

رباعیاتِ قدیم

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئینگے
جب یاد کرینگے مجھے تب روئینگے
اُلفت پہ ۔ وفا پہ ۔ جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روئے تھے تو اب روئینگے

۔ یہ رباعی سنہ ۱۳۰۱ ہجری میں جبکہ راقم حیدرآباد میں مقیم تھا اور نواب ثار الملک بہادر بمبئی سے پونا میں بازی جیت کر آئے تھے۔ لکھی تھی مگر انکی خدمت میں بھیجی نہیں گئی۔ خون آصف جاہی کے لفظ میں اس بات کا اشارہ ہے کہ حضور سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں انکے خطاب کی طرف اشارہ ہے

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گذرے
اک خستہ جگر کی رات کیونکر گذرے
گذری نہ ہو جس بغیر یہاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گذرے

یاد اُس کی یہاں وردِ مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجئے کہ ہے نام اُس کا
کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزید گمراہ!!!
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

حُر کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگیِ کوئے ضلالت کب تک؟
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

گر کفر میں **فرعون** کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
وھاں **نیل** سے بھی زیادہ پانی نکلا

قصیدے ترکیب بند مسدس اور قطعے مختلف مضامین پر بہ ترتیب اوقاتِ تحریر

۱۔ قصیدہ نعتیہ[8]

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیئے — سخن زباں کے لیئے اور زباں دہاں کے لیئے
وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں — عداوت اُس کی عذابِ الیم جاں کے لیئے
وہ شاہ جس کا مُحِب امن و عافیت میں مدام — محبت اُس کی حصارِ حصین اماں کے لیئے
وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم — رہا نہ تفرقہٗ روز و شب زماں کے لیئے
وہ پھول جس سے ہوئی سعی باغباں مشکور — رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیئے
ہلال مکہ کا۔ ماہِ دو ہفتہ یثرب کا — فروغ قوم کے۔ اور شمع دودماں کے لیئے
گھر اُس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریلؑ — در اُس کا کعبہٗ مقصود انس و جاں کے لیئے

8 یہ قصیدہ ۱۲۸۱ یا ۱۲۸۲ ہجری کا لکھا ہوا ہے اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اسکو اپنی قدیم شاعری کا نمونہ سمجھکر بدستور سابق رہنے دیا ہے کہیں کچھ تصرف نہیں کیا گیا ۱۲

پھر گرمِ طواف اُس کی بارگاہ کے گرد زمین سر بسجود اُسکے آستاں کے لئے

وہ لحظہ لحظہ تفقد وہ دمبدم الطاف رضائے خاطرِ یارانِ جانفشاں کے لئے

وہ گونہ گونہ مُدارا وہ بات بات میں مہر کشایشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لئے

گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے گہ انکسار مُدارات میہماں کے لئے

کہیں ہلاک میں تاخیر قوم سرکش کے کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لئے

صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ دعائے خیر بداندیش و بدگماں کے لئے

کہیں مقدمۃ الجیشِ انبیا و رُسُل کہیں وہ خاتمۃ الباب داستاں کے لئے

مدینہ مرجع و مآوائے اہلِ مکہ ہوا مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لئے

اِسی شرف کے طلبگار تھے کلیم و مسیح نوید۔ اُمتِ پیغمبرِ زماں کے لئے

بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہزن کا خطر ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لئے

شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے بشارت اُمتِ عاصی و ناتواں کے لئے

شفاعتِ نبوی ہے وہ برقِ عصیاں سوز کہ حکمِ خس ہے جہاں کفر و جہاں کے لئے

خدا کی ذات کریم اور نبی کا خُلق عظیم گنہ کریں تو کریں خصمت انس و جاں کے لئے

اُسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لئے

عبورِ لُجۂ عصیاں سے کسطرح ہو اگر وہ ناخدا نہ ہو اس بحرِ بیکراں کے لئے

مریضِ حرص و ہوا پائے کب شفا۔ جبتک وہ چارہ گر نہ ہو اس دردِ جانستاں کے لئے

نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لئے

ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا کیا تھا عزم اولوالعزم نے کہاں کے لئے
کرم کا دیکھئے دامن کہاں تلک ہو فراخ ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیئے
زمیں پہ ٹھیرا ہے ماوائے شاہِ عرش نشیں رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیئے
اِسی سے ہوتا ہے ظاہر عیارِ استعداد محک ہی حُبِ نبیؐ دل کے امتحاں کے لیئے
اگر نصیب ہو یثرب میں جاکے شربتِ مرگ پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیئے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے کروں نہ طولِ اَمل روضۂ جناں کے لیئے
سمایا اُس کا جو نقشِ قدم تصور میں ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے
حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخن **حالی** کہاں سے لایئے اعجاز اِس بیاں کے لیئے
نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں۔ رہے جب تک سخن زباں کے لیئے اور زباں دہاں کے لیئے

۲۔ ترکیب بند۔ مرتبہ ۱۲۸۵ھ ہجری

مرثیۂ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالب

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی وقت کوتاہ و قصۂ طولانی
عیشِ دُنیا سے ہو گیا دل سرد دیکھکر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال گوشۂ فقر و بزمِ سُلطانی
ہے سراسر فریب و وہم و گماں تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب جامِ جمشید و راحِ ریحانی

لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی　　حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک ڈھکوسلا ہے لحنِ داؤدی　　اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک　　چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے　　گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی　　اُس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر　　تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ　　ہاں قسم مجکو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اِس کی　　صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم　　جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس　　جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے　　شان ہو جس میں دلربائی کی
جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے　　خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس　　آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خانِ غالبؔ مرد

بُلبلِ ہند مر گیا ہیہات جسکی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضموں اور اُسکا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اُسکی سیدھی بات
دل میں چُبھتا تھا وہ اگر بالفرض دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا قلم اُسکا تھا اور اُس کی دوات
تھیں تو دلّی میں اُسکی باتیں تھیں لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اُسکے مرنے سے مر گئی دلّی خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یہاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم یہاں اگر ذات تھی تو اُسکی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اُسکی یاد آئیں کس کی باتوں سے دلکو بہلائیں
کس کو جا کر سُنائیں شعر و غزل کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ اُستاد کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

اُسکو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح | اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم | لوگ جو چاہیں اُنکو ٹھیرائیں
ہمنے سب کا کلام دیکھا ہے | ہے ادب شرط مونہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حُسن و جمال کی صورت | نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر | تعزیت اک ملال کی صورت
قال اُس کا وہ آئینہ جسمیں | نظر آتی تھی حال کی صورت
اُس کی توجیہ سے بگڑتی تھی | شکل امکاں محال کی صورت
اُس کی تاویل سے بدلتی تھی | رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا | سخن اُس کا مآل کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے | انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے | علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے | غالب بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج | اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اُٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اُسکی چپ سے جگر فگار ہے آج

دلمیں مدت سے تھی خلش جسکی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج

تلخیٔ غم کہی نہیں جاتی
جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا
خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اُسکے گئی بہارِ سخن
اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار
کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونقِ حسن تھا بیاں اُس کا
گرم بازارِ گلرخاں نہ رہا

عشق کا نام اُس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہلِ ہند اب کرینگے کس پہ ناز
رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک ‏ بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا ‏ وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن

کسکو ٹھیرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا ‏ اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اُس نے ادا ‏ پر کوئی اُس کا حقگزار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں ‏ سخن اُس کا کسی پہ بار نہ تھا

نذرِ سائل تھی جان تک لیکن ‏ قطعہ ‏ درخورِ ہمت، اقتدار نہ تھا

ملک و دولت سے بہرہ ور نہوا ‏ جان دینے پہ اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی ‏ سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا ‏ دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زہد کے بدلے ‏ زہد اُس کا اگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب ‏ ہمنے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا

معنیٔ لفظ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں ‏ آج بلبل نہیں گلستاں میں

شہر سارا بنا ہے بیتِ حزَن ‏ ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں　　　　اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی　　　　ڈھونڈھتے کیا ہو سیبِ و رُماں میں †

لب جادو بیاں ہوا خاموش　　　　گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں

گوشِ معنی شنو ہوا بے کار　　　　مرغ کیوں نعرہ زن ہو بستاں میں

وہ گیا جس سے بزم روشن تھی　　　　شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر　　　　سرمہ بِکتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت

آبِ حیواں پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون　　　　سکہ اپنا بٹھائیگا اب کون

ہمنے جانی ہے اُس سے قدرِ سلف　　　　اُن پر ایمان لائیگا اب کون

اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے　　　　اُسکو دل سے بھلائیگا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجایش　　　　وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون

اُس سے ملنے کو یہاں ہم آتے تھے　　　　جا کے دلّی سے آئیگا اب کون

مر گیا قدردانِ فہمِ سخن　　　　شعر ہمکو سُنائیگا اب کون

مر گیا تشنۂ مذاقِ کلام　　　　ہمکو گھر سے بلائیگا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک　　　　ہمکو چالیں بتائیگا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی　　　　غزل اُسکی بنائیگا اب کون

† مصرعِ قتیل: زباں میں شیرینی * کہ در صد سیبِ عشق و در رماں نیست

کم لنا فیہ من بکی و عویل

و عتاب مع الزمان طویل

۳۔ قصیدۂ نعتیہ

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور — مجھسے اُٹھینگے اُنکے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ — مجھسے برتر ہے میری طبعِ غیور
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے — میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہلِ عصر میں مجھکو — میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمۂ آبِ خضر کی مانند — چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت — مجھکو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثلِ یوسف دکھائے جوہرِ ذات — جسکو بکنا ہو مفت یہاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر ۱ — ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور
لک و قمری کو رخصتِ پرواز ۲ — بال و پر مفتِ صعوہ و عصفور

8 اس قصیدہ کی تمہید ۱۲۸۱ یا ۱۲۸۲ھ کے ہذیانات میں سے ہو۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن ذوق۔ آزردہ۔ غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں سیتا رام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوی سے لکھیں۔ جن دوستوں کی جا و بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرہ میں نہ آئے۔ جیسوا اپنے خریدار کی بے اتفاقی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسے کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے جنکو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدردان سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدہ کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیونکہ اُس زمانہ کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جسطرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے اسیطرح شاعری بھی سنوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتہً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا۔ لہٰذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے بے لگام گھوڑے کو ایک جھٹکا لگے اور وہ مودب ہو جائے ۱۲

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اُس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور

لذّتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اُسکو کیا قدرِ خوشۂ انگور

جسکے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روزِ روشن ہے یا شبِ دیجور

پہلے ہوگی کسی کو قدرِ ہنر
اُٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

دردِ دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھونی نہیں مجھے منظور

سخنِ حق کی داد لوں کس سے
سُن چکا ہوں فسانۂ منصور

دلِ آباد مفتِ بے ہنراں
ہو چُکا خانۂ ہُنر معمور

مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا
ہو چکی سعیِ کوہکن مشکور

ہمنے دیکھی تمیزِ اہلِ نظر
ہمنے دیکھا مذاقِ اہلِ شعور

ہے غرض ان کو صوتِ موزوں سے
نالۂ دل ہو یا نوائے طیور

ہو کسی شے سے انکی گرمیِ بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور

ہے فقط روشنی سے انکو کام
موم ہو اصلِ شمع یا کافور

ہے یہاں قائلِ انا مردود
ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دلِ اصحاب گو نہ ہو مسرور

یھاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصرِ خسرو کے اَور ہیں مزدور

دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحرِ میرا کہ رہیو غیر سے دور

ہوں تماشائے شہرِ نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور

دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
چشمہ پیدا او کارواں تشنہ بادہ پر زور و انجمن مخمور
اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
صاحبِ قدر و جاہ ہے جبتک کارفرما ہے چین میں فغفور
کاش اُس عہد میں مجھے پاتے تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور
کاش وہاں دیکھتے مجھے کہ جہاں **متنبّی** تھا مادحِ کافور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار مر گیا عندلیب[8] نیشاپور
جس سے ہوتا ہی خستہ سینۂ ہوش ہے زباں میری وہ دمِ ساطور
جس سے ہوتا ہے کور پروانہ ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور
شرح نقطہ کی گر کروں تحریر تنگ ہو عرصۂ نقوشِ مسطور
ترکِ عشقِ بتاں کریں عُشاق مجھ سے سُن پائیں گر ستائشِ حور
گر کروں ذکرِ لذتِ طاعات تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور
چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد دلِ خسرو میں ڈال دوں ناسور
کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ لے کے آؤں نویدِ عفوِ قصور
لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

8 عندلیب نیشاپور سے مراد نظیری ہے۔ لیکن اگر وہ ہوتا تو اس سے زیادہ اور کیا قدر کرتا جیسا کہ شیخ علی حزیں نے سودا کی نسبت کہا تھا کہ در پوچ گویان ہند غنیمت است ۱۲

وہ شہنشاہ۔ اُمتی جس کا / یہاں گنہگار اور وہاں مغفور

وہ خداوند۔ خدمتی جس کا / یہاں سبکسار اور وہاں ماجور

مژدہ اے اُمتِ ضعیف کہ یہاں / سعی ہوتی ہے بے کئے مشکور

لبِ شیریں کلام سے اُس کے / دوست بھی شاد غیر بھی مسرور

اثرِ فیضِ عام سے اُس کے / کعبہ آباد و میکدہ معمور

چرخ کو دے اگر وہ حکمِ سکوں / ہو غلط نسخۂ سنین و شہور

صرصرِ قہر گر چلے اُس کی / بند ہو مسلکِ صبا و دبور

جس طرف ہو وہ گرم نظارہ / جلوہ گر ہو اُدھر سے لمعۂ طور

ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن / موجزن ہو وہاں سے چشمۂ نور

بات پوچھو تو سوئے چرخ نگاہ / سینہ دیکھو تو علم کا گنجور

ہو سکے اُسکی خوبیوں کا شمار / نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور

اے ترا پایہ فہم سے برتر / اے ترا نام عرش پر مسطور

میں ترے در پہ سُن کے آیا ہوں / نام تیرا شفیعِ روزِ نشور

کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے / مگر اُمیدِ عفوِ ربِّ غفور

طبع غالب ہی اور میں مغلوب / نفس قاہر ہے اور میں مقہور

بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق / نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور

چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن / ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہرِ فرزند و خواہشِ زر و سیم — طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور
ایک بیمار اور سو آزار — ایک رنجور اور سو ناسور
نفسِ امّارہ اور دیوِ مرید — یہ ہے افعی تو وہ ہے کلبِ عقور
مجھ سے جو کام چاہیے لیجے — جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور
حسد و بغض و غیبت و بہتاں — بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور
ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی — ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور
دل لگے بندگی میں کیا امکاں — لب ہلے ذکرِ حق میں کیا مذکور
مایۂ عقل ہے نہ شورِ جنوں — دلِ بیتاب ہے نہ جانِ صبور
نہ معاصی میں تلخیٔ خجلت — نہ عبادت میں چاشنیٔ حضور
فی المثل ہے مری مسلمانی — جیسے زنگی کا نام ہو کافور
ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے — تیرے زمرے میں گر ہوا محشور
جب ترے کارواں میں جا پہنچا — پھر رہا بابِ خلد کتنی دور
دوریِ آستانِ والا سے — ہے بہت تنگ **حالی** مہجور
اب دعا یہ ہے اے شفیعِ امم — بسکہ بیتاب ہے دلِ رنجور
جا لگے تیرے در پہ کشتیٔ عمر — جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

۱۴ قصیدۂ مدحیہ ناتمام[8]

نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کی شان میں

ظلِ حق کلب علیخاں جسکے بذل و جود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا

صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکامِ دیں
زائرِ قبرِ نبیؐ اور حاجیِ بیت الھدیٰ

شاعری میں فرد موسیقی میں فارابیِ عصر
صوت روح افزا و صورت آیۂ صنعِ خدا

دولتِ برطانیہ پر اُس کی فرزندی کا حق
دولتِ عثمانیہ کو اُس سے پیوندِ ولا

اُسکی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس
اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا

قطعہ

مرجعِ اربابِ علم و فن ہے اُسکا بابِ فیض ۱
یہ وہ دعویٰ ہے کہ خود دربار ہے اسکا گوا

گلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ باردار ۲
اُن کو چُن چُن کر یہاں لایا چمن بندِ سخا

گر مناظر ہیں تو ہیں سر دفترِ اہلِ کلام ۳
اور محدث ہیں تو ہیں سرچشمۂ علم و ہدیٰ

زمرۂ اہلِ یقیں یا مجمعِ اہلِ سلوک ۴
نکتہ چینانِ مجسطی خردہ گیرانِ شفا

شاعرِ شیریں نفس یا شاطرِ سنجیدہ رائے ۵
فیلسوفِ مستدل یا عارفِ علت رُبا

بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اِس باغ میں ۶
بلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

---

[8] یہ قصیدہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں اُس وقت لکھا گیا تھا جبکہ نواب ممدوح علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپیہ سال کی جاگیر ہمیشہ کے لیئے مدرسہ کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپیہ نقد بطور چندہ کے دے چکے تھے مگر مصلحتاً اُن کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لیئے ناتمام رہا۔ اسکے اول و آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہو گئے ہیں ۱۲

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دور دست | اے خوشا وہ سرزمیں جسپر ہو تو فرماں روا
بارِ محصولات سے یہاں تک ہوئی ہلکی کہ اب | بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے دوتا
خیر تیری۔ ہے حصارِ عافیت تیرے لیئے | سیر ہوکر تجھکو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا
نعمتیں حق کی نہ بٹینگی سمیٹی زینہار | ہر بھلائی کی ملی وہ چند گر تجھکو جزا
خوانِ نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم | نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا
ہے یقیں تجھپر پڑے اصحاب محشر کی نگاہ | جب کہیں۔ کسنے کیا حق میزبانی کا ادا
دولتِ و اقبالِ روز افزوں سے تیرے ہیں عیاں | جو کہ حامی قوم کے ہیں اُن کا حامی ہے خدا
پرورش پاتی تھی جسکے سایہ دولت میں قوم | لے گئی اُن کو بہا کر موج سیلابِ فنا
کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر | ہند میں اب تکیہ گاہِ امتِ خیر الورےٰ
یہ اگر بنتے نہ کشتیبان اس طوفان میں | کشتیِ اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا
رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل | ورنہ اُن کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا
رل گئے تھے گوہرِ دُرجِ شرافت خاک میں | خاک سے تو نے اُٹھایا اُن کو اور بخشی جلا
ہو رہے تھے دودمانِ علم و دولت جاں بلب | تو نے ایک اک کے چُوایا حلق میں آبِ بقا
لُوں میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم | آبیاری سے ہے تیری ہی اُسے نشو و نما
ہے یہ وہ احسان جسکے بارِ منت سے کبھی | قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی بے روے وریا
تیرے ظلِّ تربیت میں گر رہا یہ نونہال | ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اسکی طوبیٰ سے سوا
فرض اگر کیجے اسے دیوارِ کاخِ آرزو | تو وہ پشتیباں ہے جس سے اُسکی قائم ہے بنا

اور اگر کہیئے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد — تو ہے اُس پر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

۵۔ قصیدۂ ناتمام مرقومہ سنہ ۱۲۹۴ ہجری

سرسید احمد خاں دام بقاؤہم کی شان میں

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے — جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم — خود سانپ رہ یہاں سے کب کا نکل گیا ہے

اس پر بھی اے عزیزو۔ ہے جائے فخر تمکو — دینوں میں دین بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمھارا جو گھر ہے سب سے پہلا — ہادی ہے وہ تمھارا جو ختمِ انبیا ہے

دی ہے وہ مصلحِ کل حق نے کتاب تمکو — جسنے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمھیں حکومت حکمت تمھیں عطا کی — دوراں سدا موافق تمسے یونہیں رہا ہے

اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم — اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں — فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا — یاروں پہ جسنے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اُس پہ قوم کے ہیں۔ وہ قوم کی سپر ہے — قوم اُس سے بدگماں ہے۔ وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے۔ دم سے قدم سے اپنے — جو کچھ کیا ہے اُسنے وہ کس سے ہو سکا ہے

۵۔ یہ قصیدہ اُس وقت لکھنا شروع کیا گیا تھا جب کہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سرسید کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مگر بسبب کثرت مکروہات دنیوی کے پورا نہ ہو سکا۔

ہمدردِ قوم ایسا ہمنے سُنا نہ دیکھا — یہ درد اُسکو جدکی میراث میں ملا ہے
تعلیم کی تمھاری بنیاد اُسنے ڈالی — ملکوں میں جسکا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرونِ اولیٰ کسنے کیا بتاؤ — سیّد نے کام آگر جو قوم میں کیا ہے

۶۔ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰ھ ہجری

مرثیہ مہیں برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھکے چُپ چُپ — حالی سے کہا ہمنے کہ اے بحرِ معانی
خاموش کبھی ہمنے تجھے یوں نہیں دیکھا — کیا ہوگئی وہ تیری طبیعت کی روانی
شادی میں تری تہنیتیں ہمنے سُنی ہیں — ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی
ہنسنا ہے نہ رونا ہے نہ نالہ ہے نہ نوحہ — کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تونے ہی ٹھانی
دنیا ہے یہ اک دارِ فنا۔ جس کا۔ اثاثہ — سب خاک ہے تا انجم و افلاک ہے فانی
ہو جائے گر انساں یونہیں ہر رنج میں خاموش — کس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی
اک آہ بھری سُن کے یہ حالی نے کہ جس سے — دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ — ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی
حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت — مشکل ہے کہ کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے — موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی سا بھائی — غم بھائی کا مرجانے کی ہے اُسکے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کیطرح بھائی کو پالا — سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اُسنے سنبھالا — جس بھائی کے سایہ میں کٹی اُسکی جوانی
شفقت نے دیا جسکی بھلا مہرِ پدر کو — دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اُس بھائی کے پیچھے — لذت نہیں جینے سے نصیب اُسکو اُٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جسکا عزیزو — کیا ڈھونڈھتے ہو اُسکی طبیعت میں روانی
یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ — یہ چپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں — یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لنگھانی
پر آہ۔ کلی وہ جو ہے مرجھا گئی دل کی — مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپسمیں کھلانی۔
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر — ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

۷۔ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۵ ہجری

بجناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض — کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اِس کا کہ مجھے گھر بیٹھے — اُس نے ممتاز کیا بھیجکے شاہی فرماں
نہ ہوئی مجھسے کوئی خدمتِ سرکارِ نظام — نہ کیا میں نے کبھی طوفِ درِ صدرِ زماں
نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لائقِ قدر — اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں
حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا — جسکے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیضِ سلطانی جن کی　　ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں
ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے جسطرح　　خار و گل دو نو کو کرتا ہے نہال آبِ رواں
آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار　　ملک میں اُسکا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں
یہاں وہ اُن کھیتیوں کو دیکے گیا ہی پانی　　آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں
قوم اسوقت ہی تعلیم کی جتنی محتاج　　ہے وہ عالم پہ ہویدا۔ نہیں محتاج بیاں
عزت۔ آسودگی اور ملت و مذہب اُن کا　　ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں
پھر نہ قدر اُنکی کچھ آنکھوں میں خلایق کی بلند　　اور نہ وزن اُن کا ترازو میں حکومت کی گراں
آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے　　درد کا جان لیا اُن کے کہ یہ ہے درماں
مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں ممتاز　　جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں
اُن کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم　　چشمِ عالم میں مسیحائی پہ اپنی برہاں
کرتے ہیں زندہ جاوید بنی نوع کو۔ جو　　بذل کرتے ہیں پئے تربیتِ اہلِ زماں
ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی۔ جس کا　　ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں
یہی بخشش ہے یہی جود ہے راس الحسنات　　جس پہ موقوف ہے بہبودیِ نسلِ انساں
یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز　　یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں
یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف　　یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں
دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل　　کی ہمیشہ کے لیئے ایک نے وہاں نہر رواں
اُس کی خواہش تھی کہ ہوتے ہیں پیاسے سیراب　　اِس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں — نہر جاری ہے ہے ذات انکی سوا فیض رساں
بخت اُس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر — حامیِ علم و ہنر یدارِ کمالِ انساں
اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں ہیں جبتک — شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں
آسماں جاہ سے ہو تقویت ملک دکن — اور رہے ملک دکن ملجا و ماوائے جہاں
دولتِ قیصری و دولتِ آصفجاہی — ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیباں

۸- قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۶ھ ہجری

تہنیت عید الفطر - بہ جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا — خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا
کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے — کہ اپنے صبر کا انعام ہمنے بھر پایا
رہین منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام — کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا
گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش — کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا
شگفتہ آتے ہیں اسطرح عید گاہ سے لوگ — کہ گنج اُنھوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا
حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج — کہ دن خدا نے نمایش کا اُن کو دکھلایا
عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم — خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا
حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ — خوشی نے دی ہے زمانہ کی کچھ پلٹ کایا
غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست — ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چھکوایا

اُدھر ہے فصلِ بہار اور اِدھر ہے عید الفطر — سماں نشاط کا ہی شہر و دشت پر چھایا

کھلے ہیں اُس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول — جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہی کملایا

ہزاروں سروِ خراماں ہیں شہر میں ہر سو — جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا

اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم — تو سمجھو غم کا عوض غم زدوں نے بھر پایا

مگر یہ عارضی انبساط ہے سب ہیچ — اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اِترایا

فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر — اُنھوں نے آپ کا دھوکا سراب پر کھایا

خوشی ہی جس سے عبارت وہ ہی خوشی اُنکی — جنھوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما — جنھوں نے علم کا بجھتا چراغ اُکسایا

جنھوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص — جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا

جنھوں نے خُلق سے اپنا بنایا غیروں کو — جنھوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم — کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں مُمسِک — مینہ اپنی داد و دہش کا اُنھوں نے برسایا

ہوائے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد — فضائے دہر کو خُلقِ حَسَن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر رہیں جو تیار — لیا سنبھال اُسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا — نہ مانگ سکتے تھے جو اُنکے گھر پہ پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھکر — اُنھوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا

نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے — ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیر مگر وقتِ رحم موم ضعیف کسی کی آہ سُنی اور دل اُن کا بھر آیا
وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا
وہ چونک اُٹھے کہ گویا قیامت آپہنچی جو در پہ آکے کوئی دادخواہ چلّایا
نشاط و عشرتِ جاوید کی ہے اُنکو نوید دل ایسا جنکو عنایت خدا نے فرمایا
سُنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا
بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظمِ اُمرا نہیں ہے جسکا کوئی قربِ شہ میں ہمپایہ
جو ظلِ حق ہے رعیت کے سر پہ شاہِ دکن تو اعظم الاُمرا ظلِ حق کا ہے سایہ
ہمیشہ جسکو ہے بہبودِ ملک مدِ نظر رفاہ و امن ممالک میں جسنے پھیلایا
اُٹھایا فتنہ نے جب سر فرو کیا اُسکو پڑا عمل میں جہاں عقدہ اُسکو سُلجھایا
بنائے نظم و نسق جسنے رکھی شوریٰ پر مشیرِ کار خرد پروروں کو ٹھیرایا
دکن کو جسنے کیا مرجعِ خواص و عوام دکن کا جسنے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا
نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا
بل انتظام کے رشتہ میں پڑ رہے تھے بہت سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا
لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا وہ صاحبی میں وزیرِ زماں کی پھل لایا
ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدہ نے کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہی شرمایا
زمانِ حال سے ماضی کو دیکھیے کیا نسبت اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا
خدا دراز کرے عمرِ اعظم الاُمرا دکن کو جسکی حکومت نے دن یہ دکھلایا

زمیں پہ سایہ فگن جب تک آسمان رہے — رہے دکن پہ حضورِ نظام کا سایہ

تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لائقِ نذر — سو یہ چگامۂ ناچیز پیشکش لایا

یہی بس اسکے لیئے ہوگا مایۂ نازش — جو اعظم الامرا نے قبول فرمایا

۹ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۸ ہجری

تہنیت ولادت فرزند ارجمند در شبستان اقبال جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

فیضِ رب ذوالمنن سے۔ مژدہ اے اہلِ دکن — نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر

دی بشیرِ دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے — جس سے پایا دیدۂ یعقوبؑ نے نورِ بصر

جسکو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہؑ نے — حق نے دی جسکے عطا ہونے کی سارا کو خبر

جسکے ملنے سے ہوا داؤدؑ ممنونِ قضا — جسکے پانے سے ہوا ایوبؑ مرہونِ قدر

جسکے بدلہ میں علی الرغمِ شماتت پیشگاں — حق سے ختم الانبیا نے پائے شبیرؑ و شبرؑ

جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی — جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر

جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز — جس سے ہیں اجداد زندہ اور امجد نامور

صدرِ اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف — خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ پسر یارب بحقِ عترتِ خیر الوریٰ — پائے عمرِ خضر زیرِ سایۂ مہرِ پدر

صدرِ اعظم کیطرح دربارِ آصف جاہ میں — جایگاہِ قربِ سلطانی ہو اُس کا مستقر

دولت و ثروت کو اُسکی ذات سے لگجائے شان — زیورِ علم و ادب سے ہو محلّی اس قدر

سیرتؔ و عادت میں اُس کی نکلے آن اجداد کی
جوہرِ اخلاقِ فاروقیؔ ہوں اُسمیں جلوہ گر

ملک آصف جاہ میں سر آسماں جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اُجالا صورتِ شمس و قمر

۱۰۔ قصیدہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ ہجری

اے صفر کی دوسری - روزِ دوشنبہ مرحبا
ہم نہ بھولینگے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا

ہمنے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزتِ قومی - ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے
اُسکے کچھ آثار دیکھے ہمنے یہاں بشکرِ خدا

کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم
آکے بلدہ کے سوانہ میں لگا اُس کا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں دربدر دیتے صدا

پہنچے لینے اُن کو وہ اعیان دار الملک سے
دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

قوم کو ہے جنپہ فخر اور ملک کو ہے جنپہ ناز
سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قوے

صدرِ اعظم (یعنی مدار المہام ۱۲) نے ہمیں بخشا اقامت کے لئے
وہ سرابستاں خجل ہو جس سے جنّت کی فضا

ہم غریبوں کو سمجھکر اک سفارت قوم کی
دی وہ عزت - بشکر جسکا ہو نہیں سکتا ادا

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سُنتے تھے نام
آکے یہاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا

ؔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بہادر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں ۱۲

ؔؔ یہ قصیدہ ماہ ستمبر ۱۸۹۱ء مطابق صفر ۱۳۰۹ ہجری میں بمقام حیدرآباد دکن جب کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقا کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڈھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا۔ جسکے صدر انجمن جناب نواب وقار الامراء بہادر تھے ۱۲ حالی

کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت — اُسنے کلفت کو سفر کے دل سے بالکل دھو دیا

یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہی ضرب المثل — جو کہ جا پہنچا دکن میں۔ بس وہیں کا ہو رہا

ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری — جو دکن میں آکے دیتی ہے وطن دل سے بھلا

وارثِ ملکِ دکن ہے آج وہ محبوبِ خلق — نام پر دیتا ہے جسکے جان ہر چھوٹا بڑا

ہم کہ ہیں وکٹوریا کے مہدِ رفعت میں پلے — امن و آزادی کی ہمنے کھائی ہے برسوں ہوا

جانتے ہیں ہم کہ پلتی ہے رعیت کسطرح — کسطرح ہوتے ہیں مقبولِ جہاں فرمانروا

کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیرِ قلوب — کسطرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخمِ وفا

کرلیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر — تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اُس نے ادا

ہے یہی شاہِ دکن کی گلہ بانی کی دلیل — گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

پوچھنے پچھنے کی اہلِ ملک سے حاجت نہیں — اُن کی خوشحالی پہ اُن کی تازہ روئی ہے گوا

دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار — خلق کو سرسبز دیکھا آکے یہاں اُنسے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہمنے کوہ اگر گردوں شکوہ — آکے دار الملک میں دیکھے محل گردوں نُما 8

عاملوں کی سخت گیری سے ہیں سب آزاد یہاں — بینوائے مُنعم اور مُنعم سے بڑھکر بے نوا

اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں — جیسا بے پروا نظر آتا ہے یہاں ایک اک گدا

جتنی یہاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول — بے تعصب بے تکلف بے تصنع بے ریا

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک — ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہم نوا

8 یہ اشارہ ہے اُس محل کی طرف جوکہ نواب وقار الامرا بہادر نے بلدۂ حیدرآباد کے باہر جانب جنوب پہاڑ پر زرِ خطیر صرف کرکے اپنے رہنے کے لیے بنوایا ہے اور اُسکا نام فلک نُما رکھا ہے۔

دولتِ عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیئے ۔۔۔ ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یہاں دوسرا

پارسی ہندو مسلماں یا مسیحی کوئی ہو ۔۔۔ ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہمکو یہاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ ۔۔۔ رہگذر کی سیر نے منزل سے غافل کردیا

قصہ کوتہ - بار جب ہمکو ملا دربار میں ۔۔۔ کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھکر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک ۔۔۔ واقعہ مور اور سلیماں کا ہمیں یاد آگیا

حضرتِ والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول ۔۔۔ اس پہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہی بجا

جس توجہ سے سُنی رودادِ قومی درسگاہ ۔۔۔ شکر سے اُسکے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برآ

جب سے کالج کی علیگڈھ میں بنا ڈالی گئی ۔۔۔ دولتِ عالی - مدد کرتی رہی اُس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اُس کی ہمیشہ لی خبر ۔۔۔ دمبدم پانی دیا یہاں تک کہ بار آور ہوا

اب - کہ وقت آکر پڑا تھا بانیِ کالج پہ سخت ۔۔۔ دولتِ عالی نے شرطِ دستگیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اوّل حل ۔۔۔ کی اُسی دریادلی سے اُن کی پھر حاجت روا

خود علی گڈھ کالج اور اُس کے در و دیوار سب ۔۔۔ راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی ۔۔۔ جیتے جی ہوں گی نہ اُسکے طوقِ منت سے رہا

کی ہے سرسیّد نے جو کوشش فلاح قوم میں ۔۔۔ اُس کو ہے اے اہلِ مجلس اک زمانہ جانتا

پر یہ سرسیّد سے بیڑا پار ہونا تھا محال ۔۔۔ دولتِ عالی اگر بنتی نہ اُس کی ناخدا

تھا پڑا اُس سیّد کا - سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز ۔۔۔ دولتِ عالی نے اُس خشکی میں گنگا دی بہا

ہے روایت - جبکہ ہجرت کرکے ختم المرسلیں ۔۔۔ پہنچے یثرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

جسطرح ہوتی ہے بانبی سانپ کی جائے پناہ　　ہوگا ملجا اب مدینہ بھی یونہیں اسلام کا

ہے بلاتشبیہ۔ دارالملک آصف جاہ بھی　　ہند میں اب مرکزِ اسلام بے رو و ریا

ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستاں میں انتخاب　　دولتِ عالی نے چُن چُن کر لیا سب کو بلا

تربتیں اور خانقاہیں۔ مدرسے اور مسجدیں　　سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون و چرا

حجِ بیت اللہ سے۔ جو ہر مسلماں پر ہے فرض　　ہے دکن آنا مقدم۔ شک نہیں اس میں ذرا

اول آنا چاہیئے یہاں استطاعت کے لئے　　کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا۔ ناروا

خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اُتر میں تنگ　　ہے دکن کی سمت وہ گردن اُٹھا کر دیکھتا

خواب آتے ہیں دکن کے اُسکو سوتے میں نظر　　قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا

ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں　　اور مدد کو جن کی وھاں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا

چلتے چلتے اُن کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہے جب　　کھینچنے کو اُسکے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا

ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال　　اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا

تھا جہاز اک اُسمیں معمورِ اہلِ فضل و جاہ سے　　لطمۂ امواج نے پُرزے دیئے اُسکے اُڑا

ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اُچھلے نہ پھر　　بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا

کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں اُن کو نظر　　اُس محیطِ بیکراں میں ایک زورق کے سوا

ہے وہ زورق فی المثل سرکارِ آصف جاہ کی　　ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جسکا آسرا

ہے دعا۔ جو وقت تک پانی سمندر میں رہے　　یارب اس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

● جب گاڑی یا چھکڑا بیلوں سے نہیں کھچ سکتا تو بیلوں کی جوڑی کے آگے تیسرا بیل لگا دیتے ہیں اُسکو بینڈیا کہتے ہیں ۱۲

ختم کر حالی سپاس صدرِ اعظم پر سخن | بال بال اپنا ہے جسکے شکر میں جکڑا ہوا
تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی | انجمن کے منعقد ہونے کی دی جسنے رضا
پھر ادا کر جان و دل سے شکرِ صدرِ انجمن | جسکے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا
جسنے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن | قوم کو دی عزت اور اُنکی اُمیدیں دیں بڑھا
لیکے اذنِ صدرِ مجلس کیجے پھر قصدِ وطن | ورنہ ہے حالی دکن کی دلفریب آب و ہوا
باندھ لیجے جلد اب رختِ سفر۔ ڈر ہے کہ ساتھ | قافلہ سے چھُٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

۱۱۔ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ ہجری[8]

بمقام حیدر آباد دکن

یھاں بولا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے | اول اُسکا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں
خدمتِ والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے | عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
شاعری جسکو سمجھتے ہیں کمالِ ابنائے دہر | جو لیاقت اُسمیں ہے درکار وہ ہم میں نہیں
شکر کرنا تھا ہمیں سرکار عالی کا ضرور | چند نظمیں انجمن میں اسلیئے ہمنے پڑھیں
گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت | اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

8 سنہ ۱۳۰۹ ہجری میں جو راقم اور مولٰنا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگانِ قوم آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علیگڈھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈپوٹیشن کے حیدر آباد دکن میں بحضور سرکار عالی نظام حاضر ہوئے تھے اُس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامرا بہادر لشکر باغ میں منعقد ہوا تھا۔ جسمیں راقم نے اور مولٰنا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریہ میں پڑھی تھیں جلسہ کے بعد جناب صدر انجمن نے مجھکو اور مولٰنا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیئے دولتخانہ پر طلب فرمایا تھا وھاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اُسیوقت موزوں کیا گیا تھا راقم نے پڑھا تھا۔

رہ گیا پر ہے اس کوشش میں باقی اک قصور
درگذر فرمائینگے سرکار اُس سے۔ ہے یقیں

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں۔ مگر
جھوٹ۔ جو اشعار کا زیور ہے وہ انمیں نہیں

۱۲۔ قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ ہجری بمقام حیدرآباد

در شکر اضافہ وظیفہ بہ پیشگاہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر

اے بشیر دولت و دیں۔ نائبِ شاہِ دکن
اے مہمات دکن کا ذات پر تیری مدار

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اسکا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار

جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے
پہلے ہو لیتے ہیں صدہا شکلوں سے وہ دوچار

کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اسکے فتوح
ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار

پر۔ ملا مقصود جب حالی کو اس در سے ملا
بے تردد بے تذلل بے طلب۔ بے انتظار

قدر دانی گر زمانہ میں یونہیں ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب اُمیدوار

یارب اس سرکار کو۔ ہے جس سے عالم فیضیاب
جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

۱۳۔ ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۱ء عیسوی مطابق ۱۳۰۹ھ ہجری

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا

شکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہمکو جہاں فقر و غنا کے درمیاں

(۱) اس نظم میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا دونو کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف ہیلپ سے دولت عزت نیکنامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کرکے اپنے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنےٰ درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلےٰ درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنیکی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنیکا کچھ اندیشہ نہیں کرتے۔ حالی

جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و نانخورش پر نہ اتنی۔ معدہ و احشا پہ جو گزرے گراں
جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک پر نہ ایسا ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں
ڈھانکنا چاہا بدن جب۔ تو دیا تو نے لباس پر نہ ایسا۔ جس کو حسرت سے تکیں خرد و کلاں
کھانے پینے کو کیے برتن ہمیں تو نے عطا پر نہ ایسے۔ ٹوٹنے سے جنکے ہو خوفِ زیاں
سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں پر نہ ایسا۔ جس سے اُٹھنا ہو طبیعت پر گراں
رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہمکو ہر جگہ پر نہ ایسے۔ ہو تعلق جنسے مثلِ جسم و جاں
آنے جانے کو دیئے دو پانو جہاں تو نے ہمیں جنسے ڈرلے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں
راہ اور بے راہ یکساں جنکو ہنگامِ خرام کوہ سدِّ راہ جنکا اور نہ خندق اور کُواں
کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر پر نہ ایسی۔ تختِ فرعونی کا ہو جسپر گماں
سیم و زر وقتِ ضرورت ہمکو تو دیتا رہا پر نہ اتنا۔ ہو نگہبانی میں جکی بیمِ جاں
آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز پر نہ ایسی۔ جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں
نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہمپر عیاں
راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد تاکہ کھو بیٹھیں نہ ہم اُن راحتوں کو رائگاں

وقت پر کرتا رہا باران رحمت سے نہال
قحط اور طوفان دونو سے بچایا بال بال

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر لومڑی جاتے ہیں بن جسکی بدولت شیرِ نر
چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیہ ناکسوں کے ناز بیجا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگ کوہ — وہ سبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر

فقر و حاجت میں نہو انساں کو جب صبر و شکیب — پھر نہیں کوئی بُرائی فقر و حاجت سے بتر

بھیک منگوائے جُوا کھلوائے یہ چوری کرائے — پت گنوائے آبرو کھوئے پھرائے دربدر

ہو سکے محتاج سے طاعت نہ یاد اللہ کی — لے سکے محتاج جورو کی نہ بچوں کی خبر

گہ زباں آلودہ اُس کی شکوۂ تقدیر سے — اور کبھی بوچھاڑ اُس کی آسمان پیر پر

گر بخیلوں کی مذمت پر کبھی آجائے وہ — ہو نہ سبّ و شتم سے سیری اُسے دو دو پہر

اُگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ — کھول دے غیبت کا دفتر اہلِ دولت کی اگر

گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے — تاکہ دولتمند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ سر

اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب — تاکہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر

بے حلاوت اُسکی دنیا اور مذبذب اُسکا دیں — خوفناک اُسکا ارادہ نیت اُس کی پر خطر

رات اُسکی حسرت آگیں اور دن اندوہگیں — شام اُس کی پُر نحوست اور شوم اُسکی سحر

گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا — تھا۔ مگر ثروت میں اُس سے بھی زیادہ شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت سوا اسکے شکر کی طاقت نہیں

نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال — اِس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال

نفس امارہ اور اُسپر چھیڑ مال و جاہ کی — ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جسمیں ڈال

بادِ صرصر آگ کو اسطرح بھڑکاتی نہیں — جسطرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال

ہضم کرنا اور پچانا مال و دولت کا ہے بس　　نفسِ انساں میں اگر بالفرض ہو کوئی کمال

ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم　　اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال

عقل ٹھیراتی ہے جو افعال انساں پر حرام　　کر دیئے اُسکے لیئے سب مال و دولت نے حلال

فقر میں تھا نفسِ دوں واماندہ جس پرواز سے　　آکے ثروت نے دیئے پر واسطے اُسکے نکال

خواہشیں یوں نفس میں اب دمبدم بڑھنے لگیں　　مغز میں جس طرح دیوانہ کے گوناگوں خیال

آپ کو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس　　چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال

مُسرفِ بے زر ہو جیسے قرضخواہوں میں گھرا　　خواہشوں میں اسطرح جکڑا ہوا ہی بال بال

جُھک پڑی طبعِ دَنی گر بخل و خسّت کی طرف　　ہوگئی فرزند و زن پر زندگی اُس کی وبال

اور اگر بھوت اُسکے سر پر چڑھ گیا اسراف کا　　پھر نہیں گنجینۂ قاروں کچھ آگے اُسکے مال

آگیا غالب طبیعت پر گر استسقائے حرص　　ہے سمندر سے بھی اُس کی پیاس کا بجھنا محال

باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اسقدر　　جسقدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر

دیکھ اے روباہ نفسِ دوں حذر اُنسے حذر

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی　　فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنہ سے بری

چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہی　　یہ جو ہے برزخ میانِ مکنت و دستِ تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ اور جنت اگر　　مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

وصل شیطاں کا ہو جسمیں ایسی جنت کو سلام　　منزلِ اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اِس کٹھن منزل میں ہے بتیا یہی اک بے خطر　　ہیں اِدھر کھڈ اور چڑھائی ہے اُدھر البُرز کی

رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین　　ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مُہلک سے بری

اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک　　دیکھکر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی

سُنکے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز　　مِلکے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خنا کبھی

لذتِ فقر و غنا دونو سے ہیں وہ آشنا　　اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گذرتی ہے گدا پر اُس سے ہیں وہ باخبر　　کیونکہ حالت گاہ گاہ اُنپر بھی گذری ہے یہی

امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے　　کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی

اِس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس　　جوشِ ہمدردی سے بیکل اُن کا ہو جاتا ہے جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا　　جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی

مست کی سب بے اختیاری تشنگی مخمور کی　　واردات ایک ایک کی ہے سر بسر اُنپر کھلی

جنت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقّوم دونو اُنکے ہیں پیشِ نظر

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت انسے ہے　　منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت انسے ہے

مشکلیں اکثر انھیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل　　بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت انسے ہے

ہے انھیں کے دم سے جو ہے گرمیِ ہنگامہ آج　　ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت انسے ہے

ہے جہاں دولت یہی ہیں نظمِ دولت کے کفیل　　ملک کی دولت میں ہی جو خیر و برکت انسے ہے

ہاتھ میں انکے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام　　عقل و دانش میں ہیں جن ملکوں کی شہرت انسے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
شاہ ہوں یا ہوں گدا دونوں کو قوت انسے ہے

آدمیت سیکھتے ہیں انسے سب چھوٹے بڑے
نوعِ انساں میں بقاے آدمیت انسے ہے

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یہاں
رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت انسے ہے

پاؤ گے انمیں طبیب انمیں ادیب انمیں خطیب
ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت انسے ہے

پاؤ گے ان میں مہندس پاؤ گے انمیں حکیم
آدمی مصداقِ رحمانی خلافت انسے ہے

کرتے ہیں اخلاق ادنے اور اعلےٰ انسے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت انسے ہے

ان میں قوموں کے ہیں مصلح انمیں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت انسے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت انسے ہے

دم سے ہے وابستہ انکے قوم کا سارا انتظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

گرنہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر
ہیں مفاسد گرد و پیش انکے فراہم سربسر

کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں
ہے انھیں بھی شر سے یہاں بچ بچ کے رہنا عمر بھر

گھاٹیاں فقر و غنا کی انکے ہیں دونو طرف
اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر

ایک جانب پستیِ فطرت ہے اور دوں ہمتی
ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطر

جھک پڑے گر اسطرف تو مفت کھو بیٹھے انھیں
وہ جو اڑنے کے لیئے حق نے دیئے تھے بال و پر

ڈھل گئے گر اسطرف تو اُس بلا میں پھنس گئے
جسمیں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر

برکتیں اللہ کی اُس قوم پر جس قوم میں
رہ سپر یہ طبقہ والا ہو سیدھی راہ پر

ہیں معطّل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست　　سب کی پڑتی ہے انھیں کے دست و بازو پر نظر

جو قُویٰ اُن کو ملے ہیں کام میں لائیں انھیں　　تاکہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر

فرض ہیں جو اُنکے ذمہ خالق اور مخلوق کے　　اُن میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر

قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اُسے　　کیونکہ اُسکے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر

گو نجات انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں　　جیسے بچنا گوشت سے ناخن چھٹنا ہے۔ مگر

کام دنیا میں سنوارے ہیں جنھوں نے قوم کے　　تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر

سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام　　اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جسطرح اس انجمن کے رُکن آئے ہیں تمام

قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی　　جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی

اتفاقِ قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل　　رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی

مال و دولت نامبارک ہے نہو گر اتفاق　　قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی

یہاں وکیل ایک اک ہی شہر اور ملک کا قایم مقام　　دانہ کو کرتی ہے جو خرمن وہ برکت ہے یہی

رایگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر　　راحتیں جسکی طفیلی ہیں وہ رحمت ہے یہی

فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں بھائی مجتمع　　ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملت ہے یہی

تم ہمارے کام آؤ ہم تمھارے آئیں کام　　جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

قوم کی خدمت میں ہے مُضمر ربوبیت کی شاں　　جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز　　ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی

سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار　　جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی

کر رہا ہے قوم کے سرکل کو یہ مجمع وسیع　　جزر سے افزوں ہے مد جسکا وہ رجعت ہے یہی

اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد　　ڈر نہیں اسکا کہ خود قانون قدرت ہے یہی

ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب　　طینتِ عالم میں خاصیت ودیعت ہے یہی

کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس　　جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہے یہی

دیگ تو پکتے ہی یہ پکے گی دھیمی آنچ میں　　کچھ اُبال آیا تو ہے اُسمیں غنیمت ہے یہی

انجمن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

۱۴۔ مُسدّس مرتبہ ۱۳۰۱ ہجری

مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

اے جہان آباد۔ اے اسلام کے دار العلوم　　اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دُھوم

تھے ہنرور تجھ میں اتنے۔ جتنے گردوں پر نجوم　　تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا

نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علمِ دیں　　جیسے اُمّی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں جو تھا محدِّث تھا وہ تیرا خوشہ چیں　　تھی محدث خیز اے پایۂ تخت تیری سرزمیں

تھا ثقہ بھی مسلم تیری خاکِ پاک کا

بیہقی وقت تھا ایک اک فقیہ اس خاک کا

شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر+　　آب و گل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہرِ منیر　　تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر

آج جس دولت کا بازار جہاں میں کال ہے

تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم　　آن کر اُسنے لیا تھا دوسرا جنم تجھ میں جنم

جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم　　بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی

شہر شہر اس جنس کی یہاں تجھ سے ارزانی ہوئی

خاک سے اُٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور　　اک جہاں شیوا بیانی سے ہے اُن کی باخبر

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر　　سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[8]

حُسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد+ تھا

حُسنِ معنی تیرا حصّہ اے جہاں آباد تھا

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم　　جنمیں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم

8 غاتفر سمرقند کے قریب ایک قطعۂ زمین ہے جہاں کا سرو خوبی زیبائی و راستی میں ضرب المثل ہے ۱۲ + نوشاد اور خلخ دو شہر قدیم ترکستان میں تھے جو حسن خیزی میں مشہور تھے

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم — کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے اُٹھکے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں

تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جسطرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام — تھے تمدّن میں بھی پیرو تیرے جمہورِ انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص عام — شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں

طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال — ڈھل گئے سانچے میں گویا اُسکے عادات و خصال

آکے بن جاتا تھا یھاں نقصانِ انساں کا کمال — تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یھاں

چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یھاں

ترا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب — آن کر لیتے تھے یھاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آ آکے تجھ میں شیخ و شاب — کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس و روم و زنگ کا

دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبع دوراں کا ہے جیسے اقتضا — ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا

جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا — وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا

گردش افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

غیب سے تجھکو تباہی کے خطاب آنے لگے
تجھ پہ اے دارالخلافت انقلاب آنے لگے

تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
طالع مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے

دولت و اقبال کا بندھنے لگا رخت سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اُٹھنے لگا علم و ہنر

کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گئے تیرے محدّث راہیِ دارالسلام

رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام

مجلسیں برہم ہوئیں زیروزبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب

اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب

جنکو کھو بیٹھے نظیر اُن کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا۔ اُسکا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر

تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر
جھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے سب لعل و گہر

علم ہے باقی نہ اب دولت ہی تیرے پاس وہ

اے گُلِ پژمردہ تیری کیا ہوئی بو باس وہ

دور آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا
بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا

خاک نے یہاں تیری پھر اُگلے وہ لعلِ بے بہا
جنسے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا

خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی
پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی

اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری

علمِ دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم

ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دُھوم

ملک میں ہر سو ہی پھر بول بالا تھا ترا
تھا جہاں علم و ہنر گو دوں کا پالا تھا ترا

تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اُجالا تھا ترا
پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا

چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا

لے گئی سیلِ فنا اُسکو بھی لے دلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلی! کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں؟ نازشِ دار الخلافہ مرجعِ ہندوستاں
ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا انڈماں بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں؟ واقعاتِ زندگی کر دیجے گر اُس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ ناواقف اُسے اور داستاں ہے تعجب خیز الحق سیرتِ محمود خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اُس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دار الشفا خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اُسکے در سے ملتی تھی دوا فکر نذرانہ کا تھا اُن کو نہ شکرانہ کا تھا

اُسکے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اُسنے سمجھا مال و دولت کو سدا تھے برابر اُسکے نزدیک اغنیا اور بینوا

گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا   کوئی مفلس کا نہ تھا پرسانِ حال اُسکے سوا

کرتے ہیں جو دعوئِ ہمدردئ نوعِ بشر
اُسنے باطل کر دیئے تھے اُنکے دعوے سر بسر

طبِ مسلمانوں کی لی اُسکی مسیحائی نے تھام   ورنہ اب تک اُسکی ترکی ہو چکی ہوتی تمام
رونقِ طبِ جدید اور اُسپہ میل خاص و عام   درس گاہوں اور دواخانوں کا اُسکے انتظام

دیکھ کر تھا اک زمانہ اُس کی خوبی کا مُقر
طبِ یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال و حیل   آگیا تھا رائے میں زود اعتقادوں کی خلل
دیں مگر اُس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل   طبِ یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جب فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اُسکے حملوں سے ہوئی عُہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب   پر اُلجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجأ و ماوٰے اُسیکا تھا مطب   اُسکے بیماروں کو۔ گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوءِ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مُہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جسقدر   کرتے ہیں معلوم جو اُنسے امراضِ بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھکے اُنگلی نبض پر   اُسکی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو تھرمامٹر

نارسا تھیں دوربینیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دوربیں اُس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جواں۔ خُرد و کلاں   تھے قوی پشت اُس سے ایسے جیسے پشتہ سے مکاں
جسکو نسخہ دیدیا لکھکر وہ یہ سمجھا کہ ہاں   زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یہاں

گو کہ ماتم ملک میں ہے اُسکا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب و چارہ گر   جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر
خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر   شہر میں ہوں مرجعِ کل۔ ملک میں ہوں نامور

جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں اُنکی کمال
ہے یہ سب ممکن۔ مگر محمود خاں ملنا محال

راستی اور راستبازی اُس کی تھی ضرب المثل   اُسکے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
امتحاں کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں خلل   راستبازوں کی گئی تھی ٹیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اُس آنچ میں نکلا وہ خالص اسطرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کُندن جسطرح

وہ زمانہ جبکہ تھا دلّی میں اک محشر بپا   نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا   باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موج زن تھا جبکہ دریائے عتابِ ذو الجلال

باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھکر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار
ساتھ دینا تھا کسیکا موت سے ہونا دوچار

یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار
شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر

جل نہ جائیں اسکے شعلے سے کہیں خشک و تر

ہو رہا تھا جبکہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں
کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں

ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کنواں
بال سے باریک تر تھی راہ اُن کے درمیاں

راہرو ڈگدا میں تھے اور راہ پر خوف و خطر

اُسنے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ
عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا خیر خواہ

مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ
پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُسنے کی

اہلِ انصاف اُسکو بھولے ہیں نہ بھولینگے کبھی

بالیقیں جن ملزموں کو اُسنے سمجھا بے خطا
مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا

چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا

بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بےگھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خو جسکی نہ تھی
دی گواہی جسنے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی

جسنے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی
ہاتھ سے جسنے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی

بیگناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پانو ایک اُسکا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جبکہ عنقا تھی دیانت بینِ ابناء الزماں
تھی امانت جسکی اُسکے پاس ہلکی یا گراں

خوف میں پاس اپنے رکھا اُسکو مثلِ پاسباں
کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں

ایک عالم ناخدا ترسی میں جب بیباک تھا
اُسکا دامن تھا کہ ہر دھبے سے بالکل پاک تھا

وضعداری میں نہ تھا اُسکا زمانہ میں بدل
وضع میں اُسکی تغیر تھا نہ عادت میں خلل

وقت کی تاثیر کا اُسپر نہ چلتا تھا عمل
انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل

اُسکے آگے اِن نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اُس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگانی اختیار
اُسمیں فرق آیا نہ وقتِ واپسیں تک زینہار

کوہِ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار
وضع اُسکی جو کہ تھی وضعِ سلف کی یادگار

قوم کے اریا درفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہدِ عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علایق کا تھا گو بارِ گراں
پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں

پابگل دنیا میں۔ پر دنیا کے غم سے برکراں　　رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادماں

ظاہراً پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا
دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اُسکو نہ مکروہات میں پایا کبھی　　غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی
دل کسی بادِ مخالف سے نہ کُملایا کبھی　　تلخیِ دوراں سے چتون پر نہ میل آیا کبھی

کی بسر دار المحن میں بزمِ عشرت کی طرح
عمر کاٹی دوزخِ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار　　قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار
گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار　　رنگ ہوگا چمن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار

کرتے ہیں جب اِن حوادث کے نظر انجام پر
قوم میں اک ہمکو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار　　اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار
ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار　　جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یہاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یہاں

یاں یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبتِ قحط الرجال　　ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اُسکی مثال　　ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بیہمال

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالیؔ سخن میں تھی بہت وسعت کبھی تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم راگنی نے وقت کی لینے دیا ہمکو نہ دم
نالۂ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم کوئی یہاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

۱۵ ۔ ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا

یہ خاک ۔ آج جس پر ہیں جمع اہل آرا یہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گذر چکی ہیں آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا
کل جشن فتح تھا یہاں ہو آج جشن شادی ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا
بلبن کے آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطیں اصطخر ہے کہ دلی بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد | دولھا بنا ہوا ہے تزئیں سے شہر سارا
تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل | بہرِ مدافعت ہے میدان میں صف آرا
مغلوں کے اُڑ رہے ہیں کل جشنِ فتح و نصرت | تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا
آتا ہے آج بابر لودی پہ فتح پاکر | ہیں شوقِ شاہِ نو میں پیر و جواں خود آرا
کل سُوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے | مغلوں کا آ رہا ہے گردش میں کچھ ستارا
ہے جشنِ فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا | اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا
جس دُھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر | ہے گرد اُسکے آگے جشنِ قباد و دارا
شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا | تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارہ
طیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے | گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدّہ* دوبارا
اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے | پاکر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا
ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر | بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن اُنکے اب تک سب بیِ داستاں ہیں

اے خاکِ پاکِ دہلی اے تختگاہِ شاہاں | پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں
ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو | پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یہاں
تقریبِ جشن جسمیں ہو کچھ نہ جز اُخوّت | ملکوں سے جمع آکر جسمیں ہوئے ہوں اخواں
پائین و صدر کا ہو جسمیں نہ کچھ تفاوت | خُرد و بزرگ کی ہو جسمیں نشست یکساں

* مغلوں کی سلطنت میں جشنِ سدّہ وہ جشن تھا جو سلطنت کے قائم ہونے سے پہلے دنیا میں سب سے اول آتش پرستوں میں جمشید کے عہد سے شروع ہوا اور جو بڑی دھوم دھام سے ایران
میں کیا جاتا تھا ۱۲

جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن — لایا ہو کھینچکر دل انکو۔ نہ حکمِ سلطاں
خادم ہوں جسقدر وہاں مخدومِ قوم ہوویں — مخدوم جتنے ہوں وہاں سب قوم پر ہوں قرباں
خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ وہاں تواضع — ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں
ٹھہرائیں جسکو چاہیں وہ آپ میرِ مجلس — چاہیں جنھیں بنائیں وہ آپ میرِ ساماں
آئے ہوں اسغرض سے سب ملکے تاکہ سوچیں — دنیا میں کسطرح ہوں سرسبز پھر مسلماں
ہندوستاں میں کیونکر باقی رہے نشانی — اُسقوم کی کہ تھا کل جنکے وہ زیرِ فرماں
نکلیں تو کیونکہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے — اعزاز نے تھا باندھا جنکے بڑوں سے پیماں
اُن مدرسوں کا کیونکر جاری رہے افاضہ — جنکے سبب سے زندہ نامِ حدیث و قرآں
جو مسجدیں ہیں بہرِ ذکرِ خدائے واحد — محفوظ حادثوں سے کیونکر ہوں اُنکے ارکاں
جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر ہو — اپنی طرف سے لیکن ہو سعی فرضِ انساں
ای شہ نشینِ اسلام ای معدنِ سلاطیں — ای پائے تختِ سلواتی ای دارِ ملکِ مغلاں

تو جشن گاہ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے؟

شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے — شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے
دولت کے تھے وہ جلوے ملت کا ہے یہ نقشہ — کاغذ کی تھیں وہ ناویں بیڑا یہ نوح کا ہے
بے روح تھے وہ قالب ہے اسمیں روحِ خوشی — موجِ سراب تھے وہ یہ چشمہ بقا ہے
میلے نہ وہ بچھڑتے روح انمیں گر یہ ہوتی — رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے

بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا
یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایہ ہما ہے

گم گشتہ بخت جسکو پھرتے ہیں ڈھونڈھتے ہم
لگتا ہے کچھ تو اُس کا لگتا یہیں پتا ہے

وہ مشکلیں کریگے اب حل یہیں تہیں کچھ
جن مشکلوں کا ہمکو اور تمکو سامنا ہے

ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے
معذور ہیں وہ اُنسے شکوہ نہ کچھ گلا ہے

فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوجِ دشمن
حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن
انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہمکو
ابتک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہی جان پر جب
لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بیخبر ہیں
پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفات بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب

گلشن میں فصل گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بیفکر و بیخبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے انکا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال اُنکے کچھ تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

تم سے تھے تو تھامو عزت کو قوم کی کچھ — اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یہاں ہیں

اک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے — رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں

خدمت میں اُنکی حالی کہتا ہے یہ ادب سے — اسوقت رونق افزا یہاں جتنے مہرباں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو — ورنہ بگڑنے کے یہاں آثار سب عیاں ہیں

عرصہ ہوا کہ ہمکو آنکھیں دکھا رہے ہیں — قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگرمچھ ہیں اُنکو نگلے جاتے — دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو۔ وگرنہ رہنا یہاں اسطرح پڑے گا — بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روز بد دکھائیں
ڈھونڈے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نجائیں

اشعار متفرقہ

انمیں اکثر وہ اشعار ہیں جو لوگوں کی فرمایش سے خاص خاص موقعوں پر اُردو یا فارسی وغیرہ میں لکھے گئے ہیں

تمہید رقعۂ شادیِ عروسی

شکر کیجے کونسی نعمت کا خالق کی ادا | ایک سے ہو ایک نعمت اُس کی بندوں پر سوا
اُس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی | جس نے جو مانگا وہی اُسنے مہیا کر دیا
نخلِ تر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو | سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا
کھیتیوں کو مینہ دیا ماں باپ کو اولاد دی | اُس سے دی دنیا کو رونق اِس سے آنکھوں کو جلا
عمرِ روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو | کل چھٹی تھی جن کی۔ ہے دن آج اُنکے بیاہ کا
آؤ اُسکے شکر میں سب مِلکے باہم شاد ہوں | تاکہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

ایضاً

چھٹی بیاہ یا تیج تہوار ہو | لب آب یا صحن گلزار ہو
گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب | مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب
یہ سارے خوشی کے ہیں ساماں جب | کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب
بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے | عزیزوں اور پیاروں سے عزت بڑھے

جہاں اس طرح جمع ہوں چار یار | ہیں اُس بزم پر لاکھ گلشن نثار

ایضاً

شکر کہ از فضلِ خدائے جہاں | وقت خوش از پردہ برآمد عیاں
شادیٔ دل راسبب آمد بدست | فرصتِ بزم طرب آمد بدست
تا شود از مقدمِ اہلِ کرم | کلبۂ ما غیرتِ باغِ ارم

ایضاً

رفت آسیبِ زمستاں بادِ نوروزی وزید | دوستداراں رابشارت باد و یاراں انوید
طرحِ بزم خرمی باہمدگر باید نہاد | نغمۂ شکرِ الٰہی دمبدم باید کشید

ایضاً

سلامٌ من مُحِبٍّ مستکینٍ | یلیہ الخیر والبرکاتُ تترٰی
سلامٌ رِدفُہٗ رَوحٌ وراحٌ | وبَینَ یدَیہِ للاحبابِ بُشرٰی
ودَعوۃُ شاھِدِینَ وغائِبِینا | مِنَ الاِخوانِ والخلّانِ طُرًّا

خاتمہ رقعہ شادی

فاطیبُ العیشِ فی الدنیا وارغدُہٗ | رھینۃٌ بزیاراتِ الاحباءٖ

ایضاً

ہزار دیدہ و دل فرش راہ یارانے | کہ از مسرت یاراں مسرت اندوزند
بہ شادیٔ طرب باہمدگر شوند انبار | ہزار رخ ز فروغ دلے برافروزند

ایضاً

کار احباب ساختن بتواں دوستاں را نواختن بتواں
تا بہ دہر ابر و باد خواہد ماند از شما لطف یاد خواہد ماند

اشعار غزل ناتمام

اس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں
حاضر ہو جب نہ دل ہی ہی باغ و راغ یکساں ہم دوستو گئے بھی۔ تو کیا گئے چمن میں
ہی اک خراش دل میں۔ ڈر ہے کہ بھر نہ آئے زخمی ہے قیرواں میں اور مشک ہے ختن میں
تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوئی ہے ورنہ اے فاختہ دھرا ہے کیا سرو و نارون میں

ایضاً

کسقدر یارو ہوا ہے انقلاب آگیا یاروں کے اقراروں میں فرق
خود بتادے گا تمھیں دورِ زماں بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق
ان پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گر نہ ہو نیتِ گدا میں فرق آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق
ہیں وفادار اور بھی لیکن ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعار قصیدہ ناتمام

یاد ایام کہ تھی باغ جوانی پہ بہار نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

نشہ میں چور تھے اک بادۂ پر زور کے ہم | جسکا رحمت میں نہ کلفت میں اُترتا تھا خمار
سر پہ وہ دیو قوی آگے چڑھا تھا اپنے | یاد تھا جسکا نہ عاقل کو نہ سیلاب کو اُتار
روکتا تھا نہ جسے غار نہ خندق نہ کنواں | تھے ہم اُس توسنِ سرزور پہ دن رات سوار
رہتے تھے اُس شترِ مست کی صورت بے قید | ہاتھ سے جسنے شتربان کے تڑالی ہو مہار
پند گو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دلسوز | اُن کی صحبت سے تھے اُتنے ہی زیادہ بیزار
خیر خواہ اور تھے غمخوار مربی جتنے | انکی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار
ملکے ہمجولیوں سے جان میں جان آتی تھی | ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار
اب اُمنگیں ہیں وہ دلمیں نہ ترنگیں باقی | تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

صدائے گدایانِ قوم

ڈھونڈھنے خضرِ مبارک پے کو یہاں آئے ہیں ہم | چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم
ڈر ہے جو خوشدل ہیں وہ سُنکر نہوں پژمردہ دل | سخت عبرت خیز لیکر داستاں آئے ہیں ہم
ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن | لیکے اُسکا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد[1] نے | آج اس در پر اُسیکے نوحہ خواں آئے ہیں ہم
قوم کھو بیٹھی ہی جو عباسیوں کی یادگار | جستجو میں اُسکی مشعل لیکے یہاں آئے ہیں ہم
تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا | اسلیئے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم

[1] پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے جنھوں نے اپنی جماعت کا نام گدایانِ قوم رکھا تھا ریاست بہاولپور میں چندہ وصول کرنیکے لیئے جانیکا ارادہ کیا تھا۔ اُنکا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار پڑھنے کا تھا لیکن غالباً اُنکا جانا نہیں ہوا ۔ چونکہ رئیس بہاولپور بنی عباس میں سے ہیں اور عباسیوں کی خلافت میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی اسلیئے یہ مضمون اسطرح ادا کیا گیا ۱۲

خود غرض ٹھیرائیں یا مکار ہمکو یا گدا — ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم

فخر سب بیجا ہیں اُنکے قوم ہے جنکی ذلیل — فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

ہیں بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل — اسلیئے یہاں بن بُلائے میہماں آئے ہیں ہم

تشنگی اپنی بجھانی ہو گی اے آبِ حیات — لیکے مونہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز در ہند

مژدہ ہو اہلِ شرق اب دن پھرے تمھارے — مغرب سے سوے مشرق آیا ہے مہرِ تاباں

گلہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے — ہے ایسے گلہ باں پر گلہ کی جان قرباں

ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آجکل نہیں کم — لے معدنِ بزرگی اے خاکِ انگلستاں

تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن — ہندی بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں

مہماں ہے آج اُن کا اُس شاہ کا ولی عہد — روئے زمیں کے سلطاں جسکے ہوئے ہیں مہماں

شکریۂ عطائے مدرسۂ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی بحضور سر جیمس لائل لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلبائے انگلو عربی سکول دہلی

آئے اے دلی کے دل آرا — شہر دعا گو سب ہی تمھارا

شکر کا ہم کو نہیں یارا — پر یہ ہے کہنا فرض ہمارا

ع یہ نظم چونکہ صغیر سن طالبعلموں کے لیئے لکھی گئی تھی تاکہ وہ ہز آنر کے روبرو بہیئت مجموعی کورس کے گانے کی لے میں پڑھیں اسلیئے بچوں کی سمجھ کے موافق نہایت سیدھے سادے الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں ۱۲

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

ہے دلی کے فخر کا یہ دن شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمہارا گو نہیں ممکن رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر کیسے کیسے رعیت پرور
جنسے ہے ہندستان منوّر فخر ہے انگلستان کو جن پر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آر کلارک احسان کا پتلا آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلی پر فضل خدا کا تم نے جو دلی میں اُسے بھیجا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آب و ہوائے شہر کی ساری آئی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اک باری چشمۂ حیواں کر دیا جاری
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہیگا

یوں تو ہیں سب احسان مسلّم سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم تم نے مدد کی اپنی پیہم

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

جوبلی کے جو خاص وظیفے پانچ برس کو ہمکو ملے تھے
لطف سے میعاد اُنکی بڑھا کے جیت لیئے دل آپ نے ہمسے

جبتک ملک آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
مانگے تانگے پر تھا گذارا مٹ گیا اب خلجان یہ سارا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

درس کے کمرے جسمیں ہیں اکثر — قدرِ ضرورت سے کچھ بڑھکر
بورڈروں کے رہنے کو ہیں گھر — کھیلنے کو میداں ہی سراسر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

شہر میں جا کالج کو عطا کی — کیں اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی — شرطِ حکومت تمنے ادا کی

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

تم میں ہیں جو موجود فضائل — وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب اُنکے دل سے ہیں قائل — او! سر لائل۔ او! سر لائل

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

اشعار مدحیہ

بحضور سر ڈینس افٹز پیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب۔ انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے

قیصرِ ہند کے ہیں کروڑں احسان جہاں — اُنکا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں
حکمراں آئے ہیں پنجاب میں ابتک جتنے — ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں

جبکہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا۔ اسلم
وقتِ رخصت تھا ہر اک آنکھ پہ حسرت نگراں

حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے
یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم وگماں

جانشیں اُنکے ہوئے آنکے جب سر لائل
عہدِ سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں

شکر سے عہدہ برآ اُسکے نہیں ہو سکتے
رحم و انصاف ہو اوذات سے جو اُنکی عیاں

اُٹھ گیا سر سے جب اس مُلک کے سایہ اُن کا
ہاتھ میں آپ نے لی آکے حکومت کی عناں

کار فرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ
معدلت آپ کی اُسوقت سے مشہور ہے یہاں

حیدر آباد میں۔ میسور میں۔ کلکتہ میں
نیکنامی کے کیئے کام۔ رہے آپ جہاں

ہی یہ اب آپ سے اُمید کہ پنجاب میں بھی
مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہونگی آساں

بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی
چھوڑ جائینگے ہر اک دل پہ عقیدت کے نشاں

انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل رُبا امیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا
جب وُہ تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

وہ عالمِ جوانی جسپر کہ تو ہے مفتوں
جائے گا ٹوٹ جس دم اُس کا طلسم سارا

جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تونے اُسکو
تھا جو کہ تجھکو اپنا آرامِ دل سمجھتا

چل دینگے جب وُہ سارے اُن بلبلونکی مانند
بعد از بہار جو رُخ کرتیں نہیں چمن کا

جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ
کون آکے دے گا تجھکو اُسکے سوا سہارا

بے مہریوں سے تونے جسکو کیا ہے غمگیں
تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آکے لے گا

جسطرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جاکر		پھر موسمِ خزاں میں آکر رہے ہمسے ملتا

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا		سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں		تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانہ میں بڑی بات تری		دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنسکے یہ دولت نے کہا		تجھکو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب۔ جس کو خدائی مانے		اُسکی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے		لیتے ہیں توشۂ عقبےٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے		لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما		علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال		لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں۔ مگر		میں نہ ہوں۔ تو نہیں کچھ قدرِ بشر
چند روز آگئی میں جس کے کام		زندہ تا حشر رہا اُس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا		وہ سدا خوار و نگونسار رہا
مو نہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں		اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں		پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو   کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا   درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں   میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں   ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم   کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھکو   میری عظمت نہیں باور تجھکو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا   جسنے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سن کے کہا اے دولت   شک نہیں اسمیں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہی مگر   اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھکو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی   اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجئے فرض تجھے گر چشمہ   تو ہوں اس چشمہ کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اہلِ امکاں؟   پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں

تو جو کھیتی ہے تو مینہ میں ہوں   تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں   میں ہوں اس عطر کی وہ اصل زمیں

ہے عبث تجھکو تفوق کا خیال   تو ہے گر مال تو میں راس المال

جنکے قبضے میں ہوں اے دولت   تجھپہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت

لاکھ بار اُنسے اگر بھاگے تو   بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُنکی مٹھی میں ہے تو اے دولت — طائرِ رشتہ بپا کی صورت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود — جس کا نایاب ہی عالم میں وجود
کھو کے مجھکو کوئی پاتا نہیں پھر — جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
ایک پل میری اگر دیجے گنوا — لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا
تو اگر اپنی لُٹا دے ثروت — پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
ہیں اسیواسطے جو اہلِ تمیز — میری ایک ایک پل اُنکو ہے عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس — ہے مِرا جاگتے سوتے اُنھیں پاس
جانتے ہیں حکما و عُرفا — مجھکو سرمایۂ دین و دنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں — اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہی نہ دیں
نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام — نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ اُنھیں دین کی دولت ہاتھ آئے — اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ — نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُنسے کچھ اپنی کی جائے — نہ خبر اُنسے کسی کی لی جائے
گُن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت — ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مُہلت مجھ کو — بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اسمیں ہے میرا سراسر نقصاں
کہ ہے انمول مری ایک اک آں

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جنمیں کچھ قدرِ قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

اُن کو ایسوں سے نہیں ملنا روا
جو لیاقت رکھتے ہیں اُنسے سوا

اونٹ گر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اُسکو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیئے دن کو نہ نکلے زینہار
ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرمسار

قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جُملے مقتبس از قرآن مجید

راقم کو فی الواقع مادۂ تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے۔ اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسنِ اتفاق سے بغیر اسکے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادۂ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزوِ شاعری سمجھا گیا ہے اسلئے اکثر طوعاً و کرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپج سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیئے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اُسکے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھولدے۔ اسنے کہا بھائی میں نے نبوت کا دعوےٰ کیا ہے۔ آہنگری کا دعوےٰ نہیں کیا۔ انکا مطلب اِس نقل سے یہ تھا کہ ہمنے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانا بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں اُن لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور

تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے۔ اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی اُنسے اُسوقت متعلق ہوجاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمت ہوئی۔ یا گھوڑا اختہ کیا گیا۔ یا کسی کی مینا مر گئی۔ یا مرغ پالی جیتا۔ یا بلی نے بچے دیئے ایسے وقت میں شعرا کو مقابلہ کے امتحان کا موقع ملجاتا ہے۔ جو شخص مادۂ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے اُسکا فی الجملہ اعتبار بڑھجاتا ہے راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا سے ہیٹا تھا اسلئے ہمیشہ اس امتحان سے کترا تا رہا۔ لیکن بری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں اُنمیں سے جسقدر بر دست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کردی گئیں۔ تاکہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہوجائے۔

تاریخ وفات مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جبکہ روضۂ رضواں کی راہ لی ۔۔۔ ہر لب پہ آہِ سرد تھی ہر دل میں درد تھا

اُسدن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ ۔۔۔ دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی کہ جسکو دعویِ تمکین و ضبط ہے ۔۔۔ دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد ۔۔۔ عرفی و انوری کا مگر ہمنبرد تھا

---

8 یہ تاریخ خود غالب مرحوم کی غزل کے ایک مصرعہ سے نکالی گئی ہے۔ اُنکی غزل کا مقطع یہ ہے ؎ یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا،، اخیر مصرع کے اعداد ۲۷۹۶ ہوتے ہیں۔ جب انمیں سے لفظ تاریخ کے عدد یعنی ۱۲۱۱ اور لفظ مگر کے عدد یعنی ۳۰۰ کا تخرجہ کیا گیا تو ۱۲۸۵ باقی رہے اور یہی اُنکا سال وفات ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہوئی ۲۷۹۶ - (۱۲۱۱ + ۳۰۰) = ۱۲۸۵ھ

اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد	اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جانگزا	دل تھا کہ فکرِ سال میں ہر صفحہ گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا	(سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا)
"تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیرِ فکر	حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

۱۲ ۳۰۰

تاریخ وفات محمد ابراہیم جوان مرگ طالب علم بی اے کلاس دہلی کالج

محمد براہیم چوں تنگ جاں گفت	زنخلِ جوانی ثمر بر نخوردہ
بگفتم زروئے الم سالِ فوتش	بجاں آفریں جان شیریں سپردہ

۱۲۹۲ + ۱ = ۱۲۹۳ ھ

تاریخ وفات سیّد خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیر راہیِ ملکِ بقا	سب ہوئے اندوہگیں شہر کے برنا و پیر
دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا	باغ میں نسرین و گل چرخ پہ مہر منیر
عیش میں شعر و غزل سوگ میں تاریخِ مرگ	غیب سے آئی ندا "در خلد میں ناصر وزیر"

۱۲۹۸ ھ

تاریخ طبع جعفرانِ بے مثال مؤلفہ خواجہ سیّد شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جسکی تھی احتیاج | چھپا مژدہ اے طالبانِ کمال
نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ | عیاں جس سے ہے ربع مسکوں کا حال
ملی طرفہ تر اس کی تاریخ طبع | وہ خود طرفہ ہے جیسے قیل و قال
اگر سال ہجری کی ہے جستجو | تو جغرافیہ خود بتاتا ہے سال
ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی | کہو اسکو جغرافیہ بے مثال

تاریخ بہ پایاں رسیدن بنا مہرِ سید بنا مہر مرحوم رئیس گلاوٹھی در بلند شہر بالعلی

علی آں سیدِ والا کہ باشد | بناش مہرباں جزوے زِ جزا
بود با ذاتِ او توام سیادت | چناں کز نام او مہر ست پیدا
چو ایں کاشانہ را بنیاد بنہاد | بعہدِ حاکمِ بیدار و دانا
گردس آں فیض گستر کز وجودش | شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا
چنیں گفتمش حالی سالِ تعمیر | مکان بے نظیر آباد بادا

تاریخ اورنگ نشینی حضور آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خاں بہادر فرماں روائے ملک دکن

بہ سالِ فرخ و ماہِ سعید و روزِ فرخندہ | نظام الملک محبوبِ علی خاں آصفِ ثانی

بہ تختِ سلطنت بنشست و حالی گفت تاریخش
براے وے مبارک تاج و اورنگ جہانبانی
ھ ۱ ۳ ۰ ۱

تاریخ تالیف قواعد اردو مولفہ خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اردو کی کہ جس کا
بیاں شافی ہے اور ترتیب محکم

کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی
زیادہ حجم میں اور نفع میں کم

مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ
کہ ہیں جسمیں قواعد سب فراہم

وجود اسکا ہے گو سب سے موخر
پہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم

جو قیمت پوچھئے تو ہے بہت سہل
نہ دینار اسمیں لگتے ہیں نہ درہم

اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب
تو ہے اے طالبو "اکسیر اعظم"
ھ ۱۳ ۰ ۲

تاریخ رحلت نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

دردا کہ ضیاء دین احمد بربست
رختِ سفر از جہاں کہ جاے الم است
۹ ۲ ۹

از طاق درِ ایوان و ز بزم و جلسا
بگسستہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست
۱۱۰ ۶۸ ۴۹ ۹۴ ۶ ۹ ۴

* یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ ۹۲۹ میں سے جو ضیاء دین احمد کے اعداد ہیں ۳۲۱ جو کہ طاق۔ ایوان۔ بزم اور جلسا کے اعداد کا مجموعہ ہے کم کرکے باقی یعنے ۶۰۸ کو ۶۹۴ میں جو کہ رحمت الٰہی کے اعداد ہیں ملانے سے ۱۳۰۲ حاصل ہوتے ہیں اور یہی نواب مرحوم کا سال وفات ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہے ۹۲۹ − (۱۱۰ + ۶۸ + ۴۹ + ۹۴) = ۶۰۸ + (۶۹۴) = ۱۳۰۲ھ

تاریخ طبع دیوان منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست — در اقرانِ خود کس مراورا قریں
نہ صیاد و ہموارہ از حسن خلق — پئے صیدِ آزادگاں در کمیں
نہ سحار و پیوستہ زافسون نطق — کشد ز آشیاں باز و شیر از عریں
ہے بار دار جبہہ اش انبساط — اگر مہرباں ست وگر خشمگیں
نہ بینیش گرہ گہ برابرواں — نہ یابیش افتادہ چیں بر جبیں
دو سال ست کافسونِ مہر و وفاش — ربودست صبرم ز جان حزیں
دلے دیر پیوندِ ناآشنا — کہ بودست فارغ ز مہر و ز کیں
ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید — کہ درباخت خود را بمہرش چنیں
سر رشتہ ہیہات دادم ز دست — سخن ز آسماں بود و رفت از زمیں
کنوں رانم از طبعِ دیوان سخن — کہ شد جلوہ فرما بہ نوعے گزیں
دریں روزہا کز صروفِ زماں — سخن شد مہان و سخنور مہیں
عروسِ سخن مے نیرزد بجو — بہ حسن ار بود غیرتِ حورِ عیں
صد آباد بر عاشق و عزم او — کہ در دورِ ناسازگاری چنیں
ز معنی بہ بیگانہ و آشنا — فشاندست گنجینہ از آستیں

چو دیوانِ اردوے عاشق کہ ہست — صنمخانۂ طرفہ گفتی زچیں
بہ پیرایۂ طبع آراستند — شنید ندا از ہر کنار آفریں
سخن گر چہ نبود از شے در جہاں — زشادی نہ گنجید در پوستیں
چو حالی ہمے جست تاریخ طبع — صنمخانۂ عاشق آمد سنیں

۷ ۰ ۱۳ ۴

تاریخ بنائے چاہ در محوطۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بحساب سالِ بعثتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بحسن سعیِ جناب آنریبل سر سید احمد خاں بہادر

بہ ہدایت کیجے گر سال ہجرت کی محرم سے — تو کہیے سالِ بعثت کا مہِ شوال کو مبدا
کلام اللہ اترا آخرِ ماہِ مبارک میں — ہوا اس واسطے شوال مبدا سال بعثت کا
نکالے یہ مبارک سن جنابِ سید احمد نے — بنایا جس نے دار العلم میں یہ چشمۂ زیبا
زروئے سالِ بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش — کہا ہاتف نے حالی سے کہ "چشمہ فیضِ احمد کا"

۱۲ ۲۲ ۱۳

تاریخ طبع ترجمۂ تاریخ دربارِ قیصری بحساب سال عیسوی

پنجاب کے ادارۂ تعلیمِ عام نے — ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب
دربارِ قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی — اب ترجمہ اس کا مرتب ہوا ہے خوب
ہیں لفظ دلکشا تو مضامیں ہیں دلنشیں — ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

چھپکر ہوا تمام تو حالیؔ نے یوں کہا
"دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب"

تاریخ بنائے مہمان سرا در موضع موں واقع پنجاب بحساب سال عیسوی

بحر کرم آن وزیر چند کہ باقی
نام بزرگان موں زبذل و نوالش

ساختہ منتر لکھے چو بہر غریبان
تکیہ گہ ہر غریب آمدہ سالش

تاریخ بجملۂ مقتبس از قرآن مجید

تاریخ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم دہلوی رئیس جہانگیر آباد متخلص بہ شیفتہ و حسرتی

جزاھم بما صبروا جنات وحریراً

آیہ قرآنی میں بما صبروا جنۃ وحریراً ہے چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اسلیے جنۃ کی جگہ جنات کر دیا گیا ہے۔ جیساکہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے فروح و ریحان وجنۃ نعیم کے ھمنا سدح وریحان وجنات للنعیم کر دیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے اسلیے اس آیت کا مضمون انکی وفات کے نہایت مناسب

تصور کیا گیا۔ یعنی جناب باری نے بعوض اُنکے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس اُنکو عنایت کیا۔

تاریخ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم ولد اوسط نواب محمد مصطفی خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد

وَحُلُّوٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ

۱۲ ۹۴ ہجری

چونکہ عزیز موصوف ایک وجیہ و شکیل آدمی تھے اور اُنکی وفات عنفوان شباب میں واقع ہوئی تھی اسلیئے یہ آیت انکی تاریخ وفات کے لیئے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالےٰ اہل جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ "پنھائے گئے اُنکو چاندی کے کنگن" بجائے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا اُنکی مغفرت ہوچکی۔ اور اہل جنت کے تمام حقوق اُنکو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونو کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورۂ دہر سے نکلی۔ اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آئینہ خانہ در ریاستگاہ بہاولپور

كَاَنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ

۹۶ ۱۲ ہجری

قرآن مجید میں اصل آیت "اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ" ہے تاریخ میں بضرورتِ تکمیل اعداد اور نیز بمقتضاے مقام اِنَّهٗ کی جگہ کَاَنَّهٗ کردیا گیا ہے مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے تھے اسلیے قَوَارِیر میں الف لام بڑھاکر اَلقَوَارِیر کردیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں جب سبا کی بادشاہزادی بلقیس اول ہی دفعہ وارد ہوئی تو اُسکو شیش محل کے صحن پر جسمیں آیینے لگے ہوے تھے یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے۔ اُسنے فوراً پایینچے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا "اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ" یعنی یہ تو ایک محل ہے جسمیں شیشے جڑے ہوے ہیں۔ تاریخ بنا میں اِنَّهٗ کی جگہ کَاَنَّهٗ کردینے سے یہ معنی ہوگئے کہ گویا یہ وہی سلیمانؑ کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمایش سے جو اُسوقت بہاول پور میں ملازم تھے بھیجی گئی تھی مگر ایسا سنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی۔ نہ اسلیے کہ اسمیں دو جگہ اپنی طرف سے تصرف کیا گیا ہے بلکہ اسلیے کہ نواب صاحب کا نام اسمیں نہیں تھا۔

تاریخ ولادت فرزند در حرم سرائے نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ

۸ ۱ ۳ ۱ ۸ ۸

اس آیت سے سنین مطلوبہ یعنی ۱۳۰۸ھ اسطرح نکلتے ہیں کہ آیت کے جملہ اُولٰے یعنی "حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا" کے اعداد ۱۶۵۴ ہیں۔ انہیں سے هٰذَا کا تخرجہ اور ملک کریم کا بجاے اسکے

تعمیہ کرنے سے ۱۳۰۸ حاصل ہو جاتے ہیں۔

تخرجہ و تعمیہ کا اشارہ گویا "اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ" سے نکلتا ہے۔ کیونکہ اس جملے کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے کہ نہیں ہے "ھٰذَا" مگر "مَلَكٌ كَرِيْمٌ" تو اس سے یہ مطلب مستفاد ہوگا کہ اوپر کے جملے میں ھٰذَا کی جگہ مَلَكٌ كَرِيْمٌ رکھدو۔ اور اسطرح ۱۳۰۸ حاصل ہو جاینگے۔

اصل آیت میں حاشَ لِلّٰہِ ہے بضرورت لام ضعف کر کے حاشَ کر دیا گیا ہے۔ آیت کا ترجمہ ہے (حاشا للہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو ہو نہو کوئی معزز فرشتہ ہے) جو عورتیں زلیخا کی فریفتگی پر اُسکو ملامت کرتی تھیں جب حضرت یوسفؑ دفعۃً اُنکے سامنے آئے تو اُسوقت جو الفاظ اُنکے مونہ سے نکلے تھے اُنکو قرآن میں اسطرح نقل کیا گیا ہے۔

تاریخ وفاتِ مہین برادرِ راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

۱۳ ھ

یہ تاریخ برادر زادہ راقم حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے والد مرحوم کی وفات سے چند روز بعد عین تلاوت کے وقت قرآن مجید سے اقتباس کی تھی جس سے بے کم و کاست سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مادّہ ندرت سے خالی نہ تھا اسلئے بوجہ اتحاد کے اپنی تاریخوں کے ساتھ اس تاریخ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ تاریخ برادر مرحوم کے سنگ قبر پر جو کہ دلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے جوار میں واقع ہے کندہ ہے۔

قطعات تاریخ از نتائج طبع جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

چونکہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں سے یہ چند قطعے باقی رہ گئے تھے اور انکی اشاعت کے لیئے کوئی اور موقع نہ تھا اسلیئے بطور یادگار کے انکو بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا گیا ہے۔

تاریخ وفات جناب مولنا قلندر علی زُبیری پانی پتی غفر اللہ لہٗ متخلص عالم

آن قلندر علی وحیدِ زماں — در نجابت زُبیری و سندی
خاکِ پانی پت از سکونتِ او — در جہاں شد عَلَم بہ مُستندی
مُردِ و باخویش بُرد حکمت و علم — ماند خلقے بہ کوے نابلدی
جُز دلِ او کہ بود جملہ صفا — نقد ہر کیسہ جیدست و رَدی
جُز کتابش کہ با ہمہ حسنات — درج ہر نامہ نیکی ست و بدی
گفت سالِ وفاتِ او مظہر — رفت عالم بہ جنتِ آبدی

۹۳ ۱۲ ے

تاریخ وفاتِ حافظ سعد اکبر مرحوم بانی مدرسۂ اسلامیہ پانی پت

ﻪ کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے ۱۲ — ﻪ مولوی قلندر علی مرحوم عالم تخلص کرتے تھے ۱۲

چو سعدِ اکبر آں یاری گرِ قوم | کہ مر اہلِ وطن را بود یاور

سوے جنت زدنیا رخت بربست | ازیں غم تافت دلہا ہمچو آذر

دریغ آں نیک خواہِ جملہ احباب | دریغ آں غمگسارِ ہر برادر

دریغ آں درسگاہِ اہلِ اسلام | کہ ماند از مردنش بے برگ و بے بر

چنیں سالِ وفاتش یافت مظہر | شدہ جنت مقامِ سعدِ اکبر

۰ ۰ ۱۳ ھ

تاریخ اورنگ نشینی حضور نواب آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علیخان بہادر دام اقبالہ فرمانروائے دکن

شاہِ دکن چوں نہاد حسبِ مرادِ عباد | افسرِ دولت بہ فرق پاے بر اورنگ داد

سالِ جلوسش خرد گفت کہ بے شر شدہ | فتنہ و فسق و فجور شر و فریب و فساد

۱ ۰ ۳ ۱ ھ

ایضاً

عیاں شد چو عیدِ جلوسِ نظام | بسے خوشتر از عیدِ وصلِ حبیب

خرد فرقِ اعدا تراشیدہ گفت | کہ "نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب"

۱ ۰ ۱۳ ھ

تاریخ ولادت فرزندِ ارجمند در کاشانۂ اقبال حضور نظام دام اقبالہ

شد چو خورشیدِ شرف طالع بمشکوے نظام | قدسیاں گفتند شمعِ ملک و دولت آمدہ

مظهر اندر فکرِ تاریخِ ولادت رفته بود
عقل گفت "این لعل از کانِ شرافت آماده"
ا ب ۱۳ ہجری

تاریخ مدار المهامی نواب میر لایق علی خان مرحوم در سرکارِ عالی

دوش کردم ز عقل چند سؤال — کوست حلّالِ مشکلات و عُقَد
گفتمش کے بود کہ شاہِ دکن — بنشیند بہ مسندِ اَب و جَد
گفت جشنِ جلوسِ فرّخ او — در ہزار است و سیصد ست و اَحَد
گفتمش پس کہ باشدش دیواں؟ — قرعہ بر لایقِ علی خاں زد
گفتمش سنگہا دریں راہ است — گفت زودا کہ حق بہ خواجہ رسد
گفتمش خواجہ کے شود دیواں؟ — گفت "حق میرسد بمرکزِ خود"
ا ب ۱۳ ھ

تاریخ بنا و مرمت مسجد مولنا حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری اثنا عشری پانی پتی دام ظلهم العالی

جعفری[8] مذہب بنا فرمود — بیتِ حق را کہ اعظم ست و قدیم
خبرش داد مُلہمِ صادق — کرد تعمیر کعبہ ابراہیم
ب ۱۳ ھ

8 بانی مسجد یعنی مولنا ابراہیم حسین صاحب کے والد کا نام اعظم علی اور اُن کے چچا کا نام جعفر علی اور دادا کا نام صادق علی تھا یہ تینوں نام اور خود بانی کا نام قطعہ تاریخ میں نہایت خوبی سے آیا ہے ۱۲

تمت